

DYAL SINGH PUBLIC LIBRARY

ROUSE AVENUE, NEW DELHI-1

Class No. 891.433

Book No. 9162

Accession No. 1551

**DYAL SINGH PUBLIC LIBRARY**

ROUSE AVENUE, NEW DELHI-1.

Cl. No. 891.433

29167

Ac. No. 155/ Date of release for loan

This book should be returned on or before the date last stamped below. An overdue charge of 0.6 P. will be charged for each day the book is kept overtime.

[illegible]



# جلوہ اشعار

ایک ناول

پریم چند



قیمت..... چار روپے

بیشتر کتاب منزل لاہور

اتحاد بریس مل روڈ ٹاٹا پور

دندھیا چل پہاڑ آدھی رات کی ڈرلوسی تاریکی میں کالے دیو کی طرح کھڑا  
 تھا۔ اس پر اگے ہوئے چھوٹے چھوٹے درخت ایسے نظر آتے تھے گویا اسکی  
 جھائیں ہیں اور آشت بھی دیوی کا مندر جس کے کلس پر سیاہ پتا کے ہوا کے  
 دھبے دھبے جھونکوں سے لہرا رہے تھے اس دیو کا سر معادم ہونا تھا۔ مندر میں  
 ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ نظر آتا تھا جس پر سی دھندلے تارے کا گمان ہوتا تھا۔  
 آدھی رات گزر چکی تھی چاروں طرف ہنسنیاک سنا پھایا ہوا تھا۔ گنگا جی  
 کی سیاہ نہریں پہاڑ کے نیچے سکون بخش روانی کے ساتھ بہہ رہی تھیں اور ان کے  
 پہاڑ سے ایک لذیر نغمہ کی صدا نکل رہی تھی۔ جا بجا کشتیوں پر مادر کنگاروں کے  
 آس پاس ملاخوں کے چولھوں کی آنچ نظر آ جاتی تھی۔ ایسے وقت میں  
 ایک سفید پوش عورت آشت بھی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی ہوئی تھی  
 اس کا مین چہرہ نند تھا۔ اور شرے سے شرافت برس رہی تھی۔ اس نے  
 دیر تک سر جھکائے رہنے کے بعد کہا:-

”ماتا! آج میں سال سے کوئی مشکل کا دن ایسا نہیں گذرا کہ میں نے  
 تمہارے چہرے پر سرنہ جھکایا ہو۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ میں نے

تمہارے چہرہ کا دھیان نہ کیا ہو۔ تم جگ تانی مہرانی ہو مگر تمہاری اتنی سیوا کرنے پر بھی میرے دل کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جاؤں۔  
 ماما! میں نے سیکنڈ دل برت رکھے دیوتاؤں کی اپاسنا میں کیں۔ تیرے جاترائیں کیں مگر منور تھ نہ پورا ہوا تب تمہارے سر نہ آئی۔ اب تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں تم نے سدا اپنے بھگتوں کی مرادیں پوری کی ہیں۔ کیا میں تمہارے دربار سے نراش جاؤں۔

سباما اسی طرح دیر تک ریتی کرتی رہی۔ یکایک اُس کے دل پر بیخبر گردینے والی خیریت کا غلبہ ہوا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کان میں آواز آئی ہے۔

”سیما! تجھ سے بہت خوش ہوئی۔ مانگ کیا مانگتی ہے۔  
 سباما کے رنگے کھڑے ہو گئے۔ اور کلیجہ دھڑکنے لگا۔ ”جی ہاں سال کے بعد مہارانی نے ریشمن دئے۔ کانپتے ہوئے بولی۔“ جو کچھ مانگو گی وہ مہارانی دیں گی؟“

”ہاں بے گاہ!“  
 ”میں نے بڑی تپسیا کی ماس لئے پڑا بھاری بردان مانگو گی۔  
 ”کیا لیگی؟ کبیر کا دھن؟“

”نہیں“

”اندرا کابل“

”نہیں۔“

”سرسوئی کی دیا“؟  
 ”نہیں“!  
 ”منسار کا سب سے اتم پلار تھا!“  
 ”وہ کیا ہے؟“  
 ”سیوت بٹیا“  
 ”جو نکل کا نام روشن کرے؟“  
 ”نہیں“  
 ”جو ماں باپ کی سیوا کرے؟“  
 ”نہیں“  
 ”جو دیا دان اور بلوان ہو؟“  
 ”نہیں“  
 ”پھر سیوت بٹیا کسے کہتی ہے؟“  
 ”جو اپنے دیس کا انکار کرے“  
 ”تیری بڑھی کو دھنیہ ہے۔ جاتیری اچھا پوری ہوگی۔“



## دیراگ

منشی سالک رام بنارس کے پڑا لے رئیس تھے پیشہ وکالت تھا اور موافقی  
جائداد وافر و ساسمیدھ گھاٹ پران کا عالی شان مکان آسمان سے باتیں کرتا تھا  
ذی عن ایسے بہ بچیں تیس ہزار کی آمدنی خرچہ کو کافی نہ ہوتی سادھوؤں اور بھمنوں کے  
یکے متفقہ جو کچھ کہتے برہم بھوج اور سادھوؤں کی قاضع و تکریم میں صرف ہو جاتا  
شہر میں کوئی سادھو کوئی جہاتا آجائے و منشی جی کا مہمان تھا سنسکرت کے  
ایسے عالم کہ بڑے بڑے پنڈت انکا لوہا مانتے۔ دیدانت کے اصولوں کے پابند تھے اور  
طبیعت کا میلان دیراگ کی طرف تھا۔

منشی جی کو قدرت بچوں سے بہت انس تھا سارے محلے کے بچے انکی شفقت اُمیدوار  
سے فیضیاب ہوتے بہتے تھے جب گھر سے نکلے تو بچوں کا ایک لشکر ساتھ ہوتا۔ ایک بار  
کوئی سنگدل مال اپنے بچے کو مار رہی تھا۔ ادا کا بلک بلک کر دیتا تھا منشی جی سے ضبط نہ ہوسکا  
دوڑے۔ بچے کو گود میں اٹھالیا اور عورت کے سامنے اپنا سر جھک دیا اس دلو اس نے  
اپنے لڑکے کو مارنے کی قسم کھالی جو شخص غبول کے لڑکے کا ایسا دلدادہ ہو وہ اپنے بچے کو  
کشتا پیار کریگا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب بیٹا پیدا ہوا منشی جی دنیا کے  
کل کا مال گناہ کش ہو گئے۔ کہیں لڑکے کو ہنڈولے میں جھلا رہے ہیں۔ اور  
موت ہو رہے ہیں کہیں اسے خوشنما سیرگاری میں بٹھا کر خود کھینچ رہے ہیں۔

ایک لمحہ کے لئے اُسے اپنے پاس سے جدا نہ کرتے لڑکے کی محبت میں اپنے  
تین بھیل گئے

سُبا مانے لڑکے کا نام پرتاپ چند رکھا تھا اور جیسا اُس کا نام تھا وہ  
ہی اُس کے اوصاف تھے بلا کا دہن، نہایت خوش رو، باتیں کرتا تو سُسنے والے شعر ہو جاتے  
ستارہ بلندی پستی پر چمکتا تھا! اعضا ایسے قوی کہ دو گئے قدِ قامت کے لڑکوں کی  
کچھ حقیقت نہ سمجھتا۔ اس کسنی ہی میں اُس کی چہرہ ایسا روشن اور متین تھا کہ یکا یک کسی  
غیر شخص کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتا تو وہ حیرت سے مکنے لگتا تھا۔

اس طرح بہت کھیلے چھ برس گز گئے۔ عیش کے دن پہلی طرح سن سے گزر جاتا  
ہیں اور خبر نہیں ہوتی۔ وہ سیکھتی تھی کہ دن اور صیبت کی راتیں ہیں جو کھاتے نہیں کھاتیں۔  
پرتاپ کو پیدیا ہوئے بھی کتنے دن گزرے، امبار کیا دکی دلاؤ نہ ساریں کالوں میں گونج ہی  
سی تھیں کہ چھٹی سال لگہ آہ پہنچی اور چھٹے سال کا خاتمہ پڑے دنوں کا آغاز تھا۔ نیشی سالگرہ ام  
کا دنیاوی تعلق محض نمائشی تھا۔ وہ لے لوٹا، اویسا کا زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ ظاہر میں  
لگا ہوا میں وہ معمولی دنیا داروں کی طرح دنیا کی گفتگوں سے بے رحمیدہ اور خوشنودل سے خوش  
نظر آتے مگر اُن کا دل ہمیشہ اُس علی او پڑ سرور کو کون کے مرے لیا کرتا تھا جس پر بچ کے  
جھجکیں اور خوشی کی تھکیں بول کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ الہ آباد میں کچھ کا میلہ تھا۔ ریل گاڑیوں میں جاواری روٹی کی طرح  
بھر بھر کر الہ آباد پہنچائے جا رہے تھے۔ اسی اسی برس کے بڑھے جنہیں برسوں سے اٹھنا  
دوبھر تھا۔ لنگڑا لے لے لاکھیاں ٹیکتے۔ منزلیں طے کر کر کے پریاک راج کی جا رہے تھے۔  
بڑے بڑے سادھو مہاتما جن کے درشنوں کا اشتیاق لوگوں کو ہمالیہ کی تاریک گچھاؤں

میں کھینچ لیجاتا تھا۔ اس وقت سنگا جی کی پاک لہروں سے گلے ملنے کیلئے آئے ہوئے تھے۔  
منشی سالک ماما کا بھی جی لچایا۔ سُباما سے بولے ”کل اشنان ہے۔“

سُباما۔ ”سارا محلہ سونا ہو گیا۔ کوئی آدمی نہیں نظر آتا۔“  
منشی۔ تم چلنے پر راضی نہیں ہو تیں دیر بڑا اُلفس دہتا! ایسا میلہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہو۔  
سُباما۔ ایسے میلوں سے میرا جی نہ سرتا ہے۔

منشی۔ میرا تو جی نہیں مانتا۔ جب سے سنا ہے کہ سوامی پرمانند جی آئے ہوئے ہیں۔  
تب سے ان کے دشن کے لئے طبیعت بہتر رہ رہی ہے۔

سُباما پہلے قُوان کے جانے پر راضی نہ ہوئی مگر جب کبھا کہ یہ ان کے نزدیک سے  
تب مجبوراً مان گئی۔ اُسی دن گیا رہ بجے رات کو منشی جی پر پاک راج چلے۔ چلتے وقت پر تپا  
کا دیس لیا اور پیو کیا سے گلے لگا لیا۔ سُباما نے اُس وقت دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں  
آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ اُس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ جیسے چیت کے مہینے میں کالی کالی  
کھٹاؤں کو دیکھ کر کسان کا کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ اُسی طرح منشی جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر  
سُباما لرز گئی۔ اُن کو وہ بوئیں ویراگ اور تیاگ کا اتھاہ سمندر تھیں۔ دیکھنے میں وہ  
کیسے ننھے ننھے پانی کے قطرے تھے مگر کیسے گہرے! او کیسے وسیع!

اُدھر منشی جی مکان سے باہر نکلے اور سُباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔  
کسی نے اس کے دل میں کہا کہ اب کچھ اپنے پتی کے دشن نہ ہونگے۔ دو دن گزرے۔  
تین دن گزرے۔ چوتھا دن آیا اور چلا گیا۔ یہاں تک کہ پورا ہفتہ گزر گیا اور منشی جی نہ  
لوٹے۔ تب تو سُباما کو پہلی سوسائے لگی۔ تار دئے۔ آدمی دوڑائے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔  
دوسرا ہفتہ بھی دوادش میں ختم ہو گیا۔ اور منشی جی کی واپسی کی جو کچھ رہی تھی اُمیدیں

تھیں وہ بھی خاک میں مل گئیں۔

منشی جی کا مفقود الخیر مہمانہ صرف اُن کے خاندان بلکہ سارے شہر کیلئے ایک افسوسناک تعد تھا۔ بازاروں میں، دکانوں پر نشستگاہوں میں غرض ہر جہاں طرف بھی مرکز گفتگو تھا، جو سنتا افسوس کرتا۔ کیا امیر کیا غریب۔ یہ مانتا عام تھا، اُن کی ذات سے چاندل طرف زندہ دلی پھیلی ہوتی تھی۔ اب ایک تم پھایا ہوا تھا، جن گلیوں سے وہ بچوں کی فوج لیکر نکلتے تھے وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ بچے بار بار اُنکے پاس آئے کیلئے لڑتے اور صند کرتے۔ اُن بچوں کو کیا خبر تھی کہ اب وہ محفل ویران ہو گئی، اُنکی مائیں اپنجل سے نمٹ نہ دھانپ سکتی تھیں۔ جیسے اُن کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔

لوں تو منشی جی کے غائب ہونے کا رونا بھی رو رہے تھے، مگر سب سے گناٹھ آئے وہ اڑھتیلوں اور سوداگروں کی آنکھوں سے نکلتے تھے جب تک ابھی حساب کتاب نہیں ہوا تھا۔ دس بارہ دن تو انہوں نے چل توں کر کے صبر کیا۔ مگر آخر کب تک ایک ایک کر کے حساب کی فردیں پیش ہونے لگیں۔ کسی پرچھ بھوج میں دوسو روپیہ کا گھی آیا ہے اور قیمت نہیں لگئی، کہیں سے دوسو من میدہ آیا ہوا ہے۔ نرازا کا ہزاروں کا حساب ہے، مندر بنوائے وقت ایک مہاجن سے بیس ہزار قرض لیا گیا تھا۔ وا بھی جنیل کا توں پڑا ہوا ہے، مطالبات کا تو یہ حال تھا اور انا کا یہ حال کہ بحر ایک عالیشان عمارت اور اُس کے لوازمات کے کوئی ایسی جائیداد نہ تھی جس سے کوئی رقم کٹھڑی ہو سکے اسکے سوا اب کوئی تدبیر نہ تھی کہ علاقہ نیلام ہو کر پڑھا دیا جائے اور اُس کے محاصل سے مطالبات ادا کیے جائیں۔

بیچاری سب ساما سر جھکائے بھریے پر بیٹھی ہوئی تھی اور پرتاب چند اپنے لکڑی



کے گھوڑے پر سوار آنگن میں منح کر رہا تھا کہ پنڈت مولے رام شاستری جو فلندرا کے بہنوئی تھے مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انہیں خوش دیکھ کر یاس نباما چونک کر اٹھ کھڑی تھی کہ شاید یہ کوئی خوشخبری لائے ہیں۔ ان کے لئے آسن بچھا دیا۔ اور اُمیدوار نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پنڈت جی آسن پر بیٹھا درسو گھنٹی سو گھنٹے ہوئے بولے۔ ”تم نے عہد جنفل کا حساب دیکھا؟“

سُباما۔ (مالوسانہ لہجہ میں) ”ہاں دیکھا تو“۔  
مولے رام۔ ”کم بڑی گہری ہے۔ نشی جی نے آگاہ کیا کچھ نہ سوچا۔ اپنے ہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔“

سُباما۔ ہاں اب یہ رقم گہری ہے۔ نہیں اتنا اتنا روپیہ کیلک بھوج میں ڈھکیا ہوا کیا؟  
مولے رام۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔

سُباما۔ اب تو جو ایڈیٹر کر لیا وہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔  
مولے رام۔ ہاں ایڈیٹر کی اچھا تو میل ہی ہے۔ مگر تم نے بھی کچھ سوچا ہے۔  
سُباما۔ ہاں علاقہ نیلام کر دینگے۔

مولے رام۔ رام رام یہ کیا کہتی ہو۔ علاکہ بک گیا تو پھر بات کیا رہ جائیگی۔  
سُباما۔ اس کے سوا اب کوئی تدبیر نہیں ہے۔

مولے رام۔ جھلا علاکہ ہاتھ سے نکل گیا تو تم لوگوں کا گھر سب کسے ہوگا۔  
سُباما۔ ہمارا ایڈیٹر مالک ہے۔ وہی بیڑہ پار لگا دیگا۔

مولے رام۔ یہ تو بڑے افسوس کی بات ہوگی کہ ایسے بیکاری آدمی کے لئے بالے دکھائیں۔  
سُباما۔ ایڈیٹر کو یہی منظور ہے تو کسی کا کیا بس؟

موٹے رام۔ بھلا میں ایک جگت بتاؤں کہ سانپ بھی مر جائے اور لٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

سُباما۔ ہاں تبتا ہیے آپ کا بڑا ایکار ہوگا۔  
 موٹے رام۔ پہلے تو ایک رکھاس لکھو اگر کلکٹر صاحب کو دیدو کہ الگوری باپچہ کی جائے  
 باکی روپیہ کا بندوبست ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ہم جو چاہیں گے کریں گے ٹرالکے  
 برانچ نہ آئے یا نیکی۔

سُباما۔ کچھ معلوم تو ہر آپ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں گے ؟  
 موٹے رام۔ تمہارے لئے پورے کالیدان بنسی جی کے نام پر بلا لکھا پڑھی کے پچاس  
 ہزار روپیہ کا بندوبست ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ  
 لکھا ہوا ہے تمہارے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے۔  
 سُباما۔ شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہوگا۔

موٹے رام۔ ہاں بات کی بات میں روپیہ جمع ہو گیا۔ صاحبک اسارہ بہت تھا۔  
 سُباما۔ (کچھ سوچ کر معافی کی درخواست مجھ سے نہ لکھوائی جی ایسی او نہ اپنے  
 بیتی کے نام پر قرض لینا چاہتی ہوں میں سبک ایک ایک پیسہ علائقہ سے  
 ادا کر دوں گی۔

یہ کہہ کر سُباما نے رکھائی کے ساتھ منہ پھیر لیا اور اُس کے زرد اُفسوسناک چہرے  
 پر ہلکا سا غصہ کھائی دیا۔ موٹے رام نے دیکھا بات بگڑا چاہتی ہے تو سنبھل کر بولے :-  
 » اچھا جلیسی تمہاری عمر جی۔ اس میں کوئی بے خبر جیتی نہیں ہے۔ مدد ہم نے تم کو  
 کسی طرح کا دکھ اٹھانے دیکھا تو اس دن پر لے ہو جائیگا بس اتنا سمجھ لو۔  
 سُباما تو آپ لیا چاہتے ہیں کہ میں اپنے بیتی کے نام پر دوسروں کے احسان کا بوجھ

رکھوں میں اسی گھر میں جل مرونگی۔ فاقے کرتے کرتے مر جاؤنگی۔ مگر کسی کا احسان نہ اٹھاؤں گی۔

موٹے رام۔ چھی چھی! تمہارے اوپر اوسان کون کر سکتا ہے کیسی بات منہ سے نکالتی ہو۔ کرج لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔ کون رئیس ہے جس پر لکھ دو لکھ کا کرج نہ ہو۔

سُبلما۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس قرض میں احسان شامل نہیں ہے۔  
موٹے رام۔ سُبلما! تمہاری بدھ کہاں گئی ہے۔ بھلا تم سب طرح کے دکھ اٹھا لوگی۔ مگر کیا تمہیں اس بالک پتیرس نہیں آتا۔

موٹے رام کی یہ چوٹ کا ای ٹری۔ سُبلما آبدیدہ ہو گئی اور بیٹے کی طرف پرتنگا ہوں سے دیکھا۔ اس بچے کے لئے کون کون سی تپسیا نہیں کی۔ کیا اب اس کی تقدیر میں دکھ اٹھانا لکھا ہے جو پودہ کل ہوا کے تیز جھونکوں سے بچایا جاتا تھا جس پر آفتاب کی تیز کرنیں نہ پڑنے پائی تھیں جو تروتازگی کے ہندو لے میں جھول رہا تھا۔ کیا وہ آج اس جلتی ہوئی دھوپ اور اس آگ کی لپیٹ میں مرجھائے گا۔ سُبلما کئی منٹ تک بی ٹکریں بیٹھی رہی موٹے رام دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب بازی ماری۔ اتنے میں سُبلما نے سر اٹھایا اگولی جس کے باپنے لاکھوں کو چلایا کھلایا وہ دوسروں کی آسرت نہیں بن سکتا۔ اگر آپ کا دھرم اس کی مدد کرے گا تو وہ خود دس کو کھلا کر کھائیگا (لڑکے کو بلاتے ہوئے) ”بیٹا! ذرا یہاں آؤ۔ کل سے تمہاری مٹھالی بند۔ دودھ گھی سب بند ہو جائیگا“  
روؤ گئے تو نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو پیار سے گود میں بٹھایا اور اس کے

گلگانی رخصتوں سے پسینہ پونچھ کر ایک بوسہ لے لیا۔  
پرتاب۔ کیا کہا کل سے مٹھائی بند ہوگی۔ کیوں؟ کیا حلوائی کی دوکان میں  
مٹھائی نہیں ہے؟

سُباما۔ مٹھائی تو ہے مگر اس کا روپیہ کون دیگا؟  
پرتاب۔ ہم بڑے ہونگے تو اسکو بہت سارے دیگے۔ چل ٹرچ دیکھو مال کیا  
تیز کھوڑا ہے۔ سُباما کی آنکھوں میں پھر آنسو اُڑ آئے۔ افسوس کیا اس حسن و نفاذ  
کے پتلے پر ابھی سا فلاس کی مصیبتیں آجائیں گی؟ نہیں نہیں۔ یہ خود مصیبت لائی  
مگر اپنے پیالے کے پر مصیبت کی پرچھائیں نہ لے دوں گی۔ ال تو یہ خیال کر رہی  
تھی۔ او بیٹھا اپنے غم نہ زور بد گام اس پر چڑیں کہ زیر کرنے میں ہم تن مضبوط  
تھا نیچے ہوتے ہیں دل کے بادشاہ!

الخص موٹے، اُن نے بہت کچھ حال پھیلایا۔ بہت فصاحت و بلاغت  
صوت کی مگر سُباما نے ایک قد نہیں کر کے ہاں نہ نہ۔ اُس کی اس شہداری کا  
تذکرہ جس گستاواہ واہ کی لوگوں کے دل میں اُس کی عزت دو چند ہو گئی۔ اُس نے  
وہی کیا جو ایسے سیرچیم اور دریادل آدمی کی بیوی کے نمایان شان تھا

اس کے پندرہویں دن علاقہ نیلام پر چڑھا۔ پیاس ہزار کی رقم وصول ہوئی  
کل مطالبہ چکا دے گئے۔ گھر کے بے ضرورت سامان فروخت کر دے گئے۔ مٹھائی  
میں بھی سُباما نے اندر سے اونچی اونچی دیواریں کھینچو اکے دو علیحدہ علیحدہ دیے  
ایک میں خود رہنے لگی اور دوسرا کہا یہ پراٹھا دیا۔

## نئے پڑوسیوں سے میل جول

منشی سبجین لال جہنیں نے سُبانا کا مکان کرایہ پر لیا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے روشن خیال آدمی تھے پہلے ایک سرکاری عہدہ پر ممتاز تھے مگر اپنی آزاد طبعیت کے باعث افسروں کو خوش نہ رکھ سکے۔ یہاں تک کہ ان کی ملازمتی سے تنگ کر استعفا دیا۔ دورانِ ملازمت میں تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر لیا تھا۔ نوکری چھوڑتے ہی ٹھیکہ داری کی طرف رجوع ہو گئے اور اپنی محنت اور جانتوشانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی خاصی حیثیت بنالی۔ اُس وقت ان کی آمدنی چار پانچ سو کی اوسط۔ یہ کم نہ تھی کچھ ایسی معاملہ فہم طبعیت پائی تھی کہ جس تعمیر میں ہاتھ لگا۔ تے نفع۔ یک سو نقصان نہ ہوتا۔

منشی سبجین لال کا کنبہ بہت بڑا نہ تھا۔ اولادیں تو انشیر سے کہنی دیر مگر وہ سب بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ اب اُس وقت ماں باپ آٹھ کی پٹی صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام برج رانی تھا۔ وہی والدین کی زندگی کا سہارا تھی۔

پرتاپ چند اور برج رانی میں پہلے ہی دن سے دوستی شروع ہو گئی۔ ادھڑٹھ میں دو لڑکے چڑیوں کی طرح چھپکنے لگے۔ برجین نے اپنی گڑیاں کھلوئے۔ باجے دکھانے پرتاپ نے اپنی کتابیں قلم اور تصویریں پیش کیں۔ برجین کی ماں (سوسیلہ) نے پرتاپ

کو گد میں لے لیا اور خوب پیار کیا۔ اُس دن سے دروز شام کو آتا۔ دونوں بھولی ساتھ ساتھ کھلتے ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ سو شیلادو دلیں۔ بچوں کو گد میں بھٹائی اور پیار کرتی۔ گھنٹوں ٹیکٹل لگائے دونوں بچوں کو دیکھا کرتی۔ بوجن بھی کبھی کبھی پرتاپ کے گھر جاتی مصیبت کی ماری سُبلما اُسے دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتی۔ چھاتی سے لگا لیتی اور اُس کی بھیلی بھالی باتیں سُکر اپنا غم غلط کرتی۔

ایک روز منشی سجدین للل باہر سے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرتاپ اور بوجن دونوں دفتر میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ پرتاپ کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اور بوجن دھیان لگائے سُن رہی ہے۔ دونوں نے جلد ہی منشی جی کو دیکھا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بوجن تو دوڑ کر باپ کی گد میں جا بیٹھی اور پرتاپ سر نیچا کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا کیسا ڈی شوراز کا تھا۔ سُن بھی اُٹھ سال سے زیادہ نہ تھا۔ مگر کُتر سے آنی والی عظمت جھلک رہی تھی۔ روشن اور مردانہ چہرہ۔ پاک صاف ہاتھ پاؤں۔ پتلے پتلے سرخ، ہونٹے تیز چلتی، ہونٹ لنگاہیں۔ کالے کالے بھونرے کی طرح بال اُس پر کپڑے صاف سُتھرے منشی جی نے کہا ”یہاں آؤ پرتاپ“۔ پرتاپ آہستہ آہستہ کچھ بکھپاتا۔ کچھ لیا تا قریب آیا۔ منشی جی نے پدرانہ محبت سے گد میں بٹھالیا اور پوچھا ”تم ابھی کون سی کتاب پڑھ رہے تھے؟“

پرتاپ بولنے ہی کو تھا کہ بوجن بول اُٹھی ”بابا بڑی اچھی اچھی کہانیاں تھیں۔ کیوں بابا کیا پہلے چڑیاں بھی ہماری طرح باتیں کرتی تھیں؟“

منشی جی مُسکرا کر بولے :- ”ہاں وہ خوب بولتی تھیں“

ابھی ان کے منہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ پرتاپ جس کا شرمیلان اب دُور ہو چلا تھا۔ بول اُٹھا۔ ”مہیں بوجن۔ تمہیں بھٹلاتے ہیں

یہ کہانیاں بنائی ہوئی ہیں۔“

منشی جی اس بیباکانہ تردید پر خوب ہنسنے لگے۔

اب نویر تاپ بلبل کی طرح چمکنے لگا۔ اسکول اتنا بڑا ہے کہ شہر بھر کے لڑکے اُسے مل بیٹھ جاتیں۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں جیسے تاڑ۔ بلدیو پرشاد نے جو گیندیں مہٹ لگائی تودہ آسمان میں چلا گیا۔ بڑے ماسٹر صاحب کی میز پر ہری ہری باتا بھی ہوئی ہے۔ اُس پر پھولوں سے بھرے گلاس رکھے ہوتے ہیں۔ گنگا جی کا پانی بھی ہے۔ ایسی زور سے بہتہ ہے کہ پہاڑ بھی ہو تو بہہ جائے۔ دہال ایک سادھو پایا ہیں۔ ریل دوڑتی ہے سن سن۔ اُس کا انجن بولتا ہے بھک بھک۔ انجن میں بھاپ ہوتی ہے۔ اُس کے زور سے گاڑی چلتی ہے۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ زرخیز بھی دوڑتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی کتنی باتیں نویر تاپ نے اپنی بھولی زبان میں بیان کیں۔ برجن تصویر کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی سن رہی تھی۔ ریل پردہ بھی تین بار سوار ہوئی تھی۔ مگر اُسے آج تک یہ نہ معلوم ہوا کہ اُسے کس نے بنایا۔ اودھ کیونکر چلتی ہے۔ دو تین بار اُس نے اپنے گورو جی سے یہ سوال کیا تھا۔ مگر انہوں نے یہی کہہ کر ڈال دیا کہ بچہ ایشور کی مہما ابرم پار ہے۔ برجن نے بھی سمجھ رکھا تھا کہ ایشور کی مہما کوئی بڑا بھاری اور طاقتور گھوڑا ہوگا۔ جو اتنی گاڑیوں کو سن سن کھینچے لئے جاتا ہوگا۔ جب پرتاپ مویش ہوا تو برجن نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا:-

”بابا ہم بھی پرتاپ کی کتاب پڑھیں گے۔“

منشی۔ بیٹی تم تو سنسکرت پڑھتی ہو۔ یہ تو بھاشا ہے۔

برجن۔ تو میں بھی بھاشا ہی پڑھوں گی۔ اس میں کسی اچھی اچھی کہانیاں ہیں۔

میری کتاب میں تو ایک کہانی بھی نہیں۔ کیوں بابا پڑھنا کہتے ہیں؟  
 منشی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ اُنہوں نے آج تک خود کبھی غم نہ نہیں کیا تھا کہ  
 پڑھنا کیا چیز ہے۔ ابھی وہ سر ہلکے مچھل رہے تھے کہ پتا پ بول اُٹھا۔ ”مجھے تم نے  
 پڑھتے دیکھا۔ اسی کو پڑھنا کہتے ہیں“  
 برجن۔ کیا میں نہیں پڑھتی۔ میرے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہتے؟  
 برجن سستھانت کو مدی پڑھ رہی تھی۔ پتا پ لے کہا۔ ”تم ٹوٹے کی طرح  
 ریتی ہو۔“



## رشتہ اتحاد مضبوط ہوتا ہے

کچھ عرصہ سے سُبمانے گنجائش نہ دیکھ کر مہرجن کہار اور دو مہروں کو جنابے یدیا تھا۔ کیونکہ اب نہ تو اُن کی کوئی ضرورت تھی اور نہ اُن کا خرچہ سنبھالے سنبھلتا تھا۔ صرٹ ایک بڑھیا مہری باقی رہ گئی تھی۔ اوپر کا کام کاج وہ کرتی اور کھانا سُبمانے ہاتھ سے پکا لیتی۔ مگر بیماری ایسی سخت محنت نِعادی تو تھی نہیں۔ چند ہی دنوں میں اسے تھکن کے سبب سے رات کو حرارت رہنے لگی۔ فیر رفتہ بہ نسبت پہنچی کہ جب دیکھے حرارت موجود نہ تھنکا جاتا ہے۔ نہ کھانے کی طرف رغبت ہے نہ پینے کی طرف۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ ہے کہ روز معمول کے موافق کام کئے جاتی ہے۔ دوا دارو کی بھی کوئی فکر نہیں اور نہ کسی سے اُس کا ذکر کرتی ہے۔ جب تک پرتاپ گھر پر رہتا ہے۔ تب تک وہ چہرے کو ذرا جی بدھم نہیں ہونے دیتی۔ مگر جوں ہی وہ مدرسہ چلا جاتا ہے۔ لحاف اوڑھ کر پڑھتی ہے اور دن بھر پڑے پڑے کراہا کرتی ہے۔

پرتاپ سمجھا رہا تھا کہ ماں کی حالت روز بروز خراب ہوتے دیکھ کر تالیا کہ یہ ہمارے ایک ن اسکول سے لوٹا تو سیدھا اپنے گھر گیا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی سُبمانے اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی مگر مارے ضعف کے چکر آ گیا۔ اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ پرتاپ نے اُسے سنبھالا اور اُسکی طرف ملاحظت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا: "ماں تم کج

کل بیمار ہو گیا۔ اتنی دُلی کیوں ہو گئی ہو۔ دیکھو تمہارا جسم کتنا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔“

سباما نے ہنسخری کو شمش کی۔ اپنی بیماری کا اظہار کر کے بیٹے کو کیسے تکلیف دے۔ ماما پاپاک اور بے غرض محبت کا انتہائی درجہ ہے۔ آواز کو ہلکا بنا کر بولی :- ”میں بیٹیا بیمار تو نہیں ہوں۔ آج ذرا حرارت ہو آئی تھی۔ شام تک بالکل اچھی ہو جاؤ گی۔ المدی میں حلو رکھا ہوا ہے نکال لو۔ نہیں تم آؤ بیٹھے میں ہی نکالے دیتی ہوں“

پرتاپ۔ اماں تم مجھ سے بہانہ کرتی ہو۔ تم ضرور بیمار ہو۔ ایک دن میں کوئی اتنا دبا نہیں ہو جاتا۔

سباما۔ (ہنس کر) کیا تمہارے دیکھنے میں میں دُلی ہو گئی ہوں۔ مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔ پرتاپ۔ میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتا ہوں۔

سباما۔ پرتاپ کا ہاتھ پکڑ کر تم کیا حال وہ کہاں رہتے ہیں؟ پرتاپ۔ پوچھنے پوچھنے چلا جاؤں گا۔

سباما کچھ اور کہا جاسکتی تھی۔ کہ اُسے پھر حکم آیا۔ آکھیں پھر آگئیں۔ پرتاپ اُس کی یہ حالت دیکھتے ہی سہم گیا۔ اور کچھ تو نہ ہو سکا۔ دوڑا ہوا برجن کے دروازہ پر آیا اور کھڑا ہو کر رونے لگا۔

ہر روز وہ اس وقت تک برجن کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ آج جو دیر ہوئی تو وہ گھرائی ہوئی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ بیکانہ جت دوازا پر جھانکنے آئی تو پرتاپ کے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے دیکھا۔ پہلے تو سمجھی کہ اُسے دل لگی سے منہ چھپا لیا ہے۔ مگر جب اُس کے

ہاتھ ہٹائے تو آنسو نظر آئے۔ چونک کر بولی ”لو کہیں روتے ہو؟ بتا دو۔“

بہنہاپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اور سسکنے لگا۔

برجن۔ نہ بتاؤ گے کیا سچی نے کچھ کہا ہے۔ جاؤ تم جُپ نہیں ہوتے۔

پتہ پانے کہا۔ ”بہنیں برجن۔ اماں بہت بیمار ہیں۔“

یہ سننے ہی برج رانی دوڑی اور دم زدن میں سُباما کے سر ہانے آکھڑی ہوئی دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور سانس زور زور سے چل رہی ہے ہاتھ پکڑ کر کھنچوڑنے لگی۔ ”سچی کیسا جی ہے۔ آنکھیں کھولو کیسا جی ہے؟“

مگر سچی نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تب اُس نے طاق پر سے تیل اتار لیا اور سُباما کے سر میں ڈال کر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ اُس غریب کے سر میں مہینڈل سے تیل پڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ٹھنڈک پہنچتی تو آنکھیں کھل گئیں۔

برجن۔ سچی۔ کیسا جی ہے؟ کہیں درد تو نہیں؟

سُباما۔ نہیں بیٹی درد کہیں نہیں ہے۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ بھصیا کہاں ہے؟

برجن۔ وہ تو میرے گھر ہیں۔ بہت بد رہے تھے۔

سُباما۔ تم جاؤ اُسکے ساتھ کھیلو۔ اب میں بالکل چھی ہوں۔

برجن۔ میں ابھی نہ جاؤنگی جب تم اچھی ہو جاؤنگی۔ تب جاؤنگی۔

ابھی یہی باتیں ہونے ہی تھیں کہ سوسیلہ بھی داخل ہوئی۔ اُسے سُباما سے ملنے کا تو بہت دلوں سے اشتیاق تھا۔ مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اس وقت عیادت کے بہانے سے پہنچی برجن نے اپنی ماں کو دیکھا تو اچھل پڑی اور تالی بجا بجا کر کہنے لگی۔ اماں آئیں۔ اماں آئیں۔

دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں چرخ چلی گیا۔ کسی کو خیال بھی نہ رہا کہ پرتاپ کہاں ہے۔ ذرا دیر تک تو وہ دوڑنے پر کھڑا رہا پھر ہیک ایک آنکھیں پونچھ کر ڈاکٹر کے مکان کی طرف لپکتا ہوا چلا۔ ڈاکٹر صاحب نشی سالن کے دوستوں میں تھے اور جب کبھی ضرورت ہوتی وہی بلاتے جاتے۔ پرتاپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بنامدی کے کنسے لال نیگلے میں رہتے ہیں۔ اُسے اب تک اپنے محلے سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اس وقت فرزند نہ جوش کی بیقراری میں اُسے ان رکاوٹوں کا مطلق دھیان نہ آیا گھر سے نکل کر بازار میں آیا اور ایک دیکھنے والے سے بولا لال نیگلے چلو گے، لال نیگلے مشہور ہو چکے تھے۔ یکہ دلا تیار ہو گیا۔ اور آٹھ بجتے بجتے ڈاکٹر صاحب کی فون بیل کے دو انے پہنچے۔ یہاں اس وقت چارہ طرف اُسکی تلاش ہو رہی تھی کہ دفعتاً وہ متنا کے ساتھ قدم بڑھاتا آندا گیا۔ اور بولا۔ ”پرہہ کو ڈاکٹر صاحب آتے ہیں“

شیدا اور سید سلار دونوں چونک پڑیں سمجھ گئی کہ یہ ڈاکٹر صاحب بلانے چلا گیا تھا۔ سُبانا نے فطرتاً ہی محبت سے اُسے گود میں بٹھالیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر پکھنے لگی۔ کیا کیلے چلے گئے۔ تیرہ تہہیں استے کیسے معلوم ہوا۔ در نہیں لگا، ہم سے بتلایا بھی نہیں۔ یونہی چلے۔ تم کھو جانے تو میں کیا کرتی۔ ایسا لال کہاں پاتی۔ یہ کہہ کہہ کماں نے بیٹے کو باہر چھوڑا۔ پرتاپ ایسا خوش تھا گویا امتحان میں پاس ہو گیا۔ ذرا دیر میں پرہہ ہٹا اور ڈاکٹر صاحب آئے سُبانا کی نبض دیکھی تیشفی دی۔ پرتاپ کو گود میں بٹھا کر باتیں کرتے رہے۔ دو اساتذہ لیتے آئے تھے۔ اُسے بلانے کی تاکید کر کے نو بجے اپنے نیگلے کو واپس گئے۔ مگر چونکہ بخار پڑا تھا۔ پوہے ہی میں بھر سُبانا کو کڑی کڑوی دوائیں پینی پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب دونوں وقت آتے اور ایسی توجہ اور شفقت

سے پیش آتے۔ گویا سُباما اُنکی بہن ہے۔ ایک دفعہ سُباما نے درتے درتے فیس کے روپے ایک طشتری میں رکھ کر پیش کئے گاؤں کے صاحب نے انہیں ہاتھ تک نہ لگایا۔ صرف اتنا کہا۔ ”اُسے میری طرف سے پرتاپ کو دیدیجیگا۔ وہ پاؤں پاؤں مدد سے جاتا ہے۔ پیر گاؤں مول لے لیگا۔“

برجن اور اس کی ماں دونوں آٹھوں پہاڑ کی تیارداری کے لئے حاضر ہستیں۔ ماں چاہے تساہلی بھی کر جائے مگر برجن وہاں سے ایک دم کو بھی نہ ہٹتی۔ دو بلاتی۔ پانی دیتی۔ جب سُباما کی طبیعت ہلکی ہوتی تو اُس سے بھولی بھولی باتیں کر کے اُسکا دل بہلا دیتی۔ کھیلنا کودنا سب چھوٹ گیا۔ جب سُباما بہت اصرار کرتی تو درادیر کے لئے پرتاپ کے ساتھ باغیچہ میں کھیلنے چلی جاتی۔ پرتاپ جلتے ہی پھر آ بیٹھتی اور جب تک مارے نیند کے جھک جھک پڑتی وہاں سے اُٹھنے کا نام نہ لیتی۔ بلکہ اکثر وہیں سو جاتی۔ رات کو آدمی کو دیکھ کر لیجاتا۔ نہیں معلوم اُسے ایسی کیا دھن سوار ہو گئی تھی۔

ایک دن برجن نے سُباما کے سر پرانے بیٹھے پٹکھا جھل رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں غرق تھی۔ آنکھیں دیرانگی طرف لگی ہوئی تھیں اور جس طرح بد خصلت پر جانبدار لہراتی ہے اُسی طرح ہلکی ہلکی مسکراہٹ اُسکے لبوں پر لہرا رہی تھی۔ اُسے مطلق خبر نہ تھی کہ بچی میری طرف تاک رہی ہیں۔ دفعتاً اُسکے ہاتھ سے پٹکھا چھوٹ پڑی جوں ہی وہ اسے اُٹھانے کے لئے بٹھکی کہ سُباما نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ اور چپکاد کر پوچھا:۔ ”برجن سچ بتلاؤ۔ تم اب کیا سوچ رہی تھیں؟“

برجن نے سر جھکایا اور کچھ شرارہ بولی۔ ”کچھ نہیں تم سے نہ بتلاؤ گی“

شبلما (چمکا کر) میری ابھی برجن۔ بتا دے کیا سوچتی تھی۔  
 برجن۔ (جلتے ہوئے) سوچتی تھی کہ..... جاؤ ہنسومت..... نہ بتلاؤ گی۔  
 شبلما۔ اچھا نہ ہنسینگی۔ بتاؤ۔ لے یہی تو اب چھا نہیں لگتا۔ پھر میں آنکھ بند کر دو گی۔  
 برجن۔ کسی سے کہی تو نہیں؟  
 شبلما۔ نہیں کسی سے نہ کہی گی۔  
 برجن۔ سوچتی تھی کہ جب پرنا پیسے میرا بیاہ ہو جائیگا تو خوب مرنے سے رہی گی۔  
 شبلما نے اسے سینے سے چٹالیا اور بولی پیلی یہ تو ترابھالی ہے۔  
 برجن۔ ہاں بھائی ہے میں جان لگی تم مجھے بہنو بننا ڈی گی۔  
 شبلما۔ آج جلتو کو آ لے دو۔ اس سے پوچھ لی دیکھیں کیا کہتا ہے  
 برجن۔ نہیں نہیں ان سے نہ کہنا۔ میں تمہارے پیروں پڑوں۔  
 شبلما۔ میں تو کہہ دوں گی۔  
 برجن۔ تمہیں ہماری قسم ان سے نہ کہنا۔

## شرفیاء زندگی کے اظہارے

دن جلاتے دیر نہیں لگتی۔ دو سال گزر گئے۔ پندت موٹے رام روز علی الصباح آتے اور سدا دعائت کو مدی پڑھاتے۔ حالانکہ اب ان کا محض بیٹا تھا۔ کیونکہ اس کتاب کے پڑھنے میں برہمن کا دل مطلق نہ لگتا۔ ایک وزا بنجیر کے دفتر سے آئے۔ کمرہ میں بیٹھے تھے۔ نوکر جوئے کا قیہ کھول رہا تھا کہ ردھیا مہری مسکراتی ہوئی گھر میں نکلی اور ان کے ہاتھ میں ایک سر بہ لافہ رکھ دیا اور منہ پھیر کر کہنے لگی۔ سر زامہ پر لکھا ہوا تھا۔ بخود مت جناب بابا صاحب برسد۔

منشی۔ ارے تو کس کا لافہ لے آئی۔ یہ میرا نہیں ہے۔

مہری۔ سر کا ہی کا تو ہے۔ کھولیں تو آپ۔

منشی۔ کس نے دیا کوئی آدمی باہر سے آیا تھا؟

مہری۔ (مسکراتی ہوئی) آپ کھولیں گے تو پتہ لگ جائیگا۔

منشی جی نے حیرت میں آکر لافہ کھولا تو یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

بابا کو برہمن کا پر نام اور پالاکن پہنچے۔ یہاں آجکی کرپا سے کشتل منگل ہے۔ ایک کشتل منگل ہنری وشنو ناتھ جی سے سلام کیا کرتی ہوں میں نے پرتاپ سے بھاشا سیکھی و اسکول سے شام کو آکر مجھے رشتہ پڑھاتے ہیں اور آپ پ ہمارے لئے ابھی اچھی کتابیں لائے۔ کیونکہ پڑھنا ہی زندگی کا شکھ ہے اور ودیا اعلیٰ چیز ہے۔ وید پران میں اسکا

ہاتھ لکھا ہوا ہے آدمی کو چاہیئے کرو تیا دھن دل و جان سے جمع کرے۔ دیا سے  
سب دکھ دور ہو جاتے ہیں میں نے کل شام کو بتیل پچھسی کی کہانی سنی تھی  
انہوں نے مجھے ایک خوبصورت گریبا نام دی ہے۔ بہت اچھی ہے۔ میں اس کا بیاہ  
کر دوں گی۔ تب آپ سے روپیہ لوں گی۔ میں اب پڑت جی سے نہ پڑھوں گی۔ اہل نہیں جانتی  
کہ میں بھانسا پڑھتی ہوں۔  
’آپ کی پیاری ’برجن‘

اقاب دیکھتے ہی منشی جی کے کلیجے میں گدگدی محسوس ہونے لگی پھر تو ایک ہی  
نظر میں سارا خط پڑھ ڈالا۔ مارے خوشی کے ننگے پاؤں پٹختے ہوئے اندر دوڑے۔  
رتا پٹا تو گد میں اٹھالیا۔ اور دونوں پچھل کا ہاتھ پکڑے ہوئے سوسیلہ کے پاس  
گئے۔ ’خط دکھا کر کہا۔ ’بوجھو کس کا خط ہے؟‘

سوسیلہ۔ ’لاڈا ہاتھ میں دو۔ دیکھوں۔‘

منشی جی۔ ’نہیں وہیں سے بیٹھے بیٹھے بتاؤ۔ جلدی۔‘

سوسیلہ۔ ’بوجھ جاؤں تو کیا دوں گے۔‘

منشی جی۔ ’پچاس روپے دودھ کے دھوئے ہوئے۔‘

سوسیلہ۔ ’پہلے روپیہ نکال کر رکھ دو۔ نہیں تو مکر جاؤ گے۔‘

منشی جی۔ ’مکر لے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ ابھی روپیہ لو۔ ایسا کوئی ٹٹ پونجیا  
سمجھ لیا ہے؟‘

یہ کہہ کر دس روپیہ کا ایک نوٹ جمیب سے نکال کر دکھایا۔

سوسیلہ۔ ’کتنے کا نوٹ ہے؟‘

منشی جی۔ ’پچاس روپیہ کا۔ ہاتھ میں لیکر دیکھ لو۔‘



سو سیلا۔ لے لوگی۔ کہے دیتی ہوں۔  
 منشی جی۔ ہاں ہاں۔ لے لیتا۔ پہلے بتاؤ تو سہی۔  
 سو سیلا۔ لٹوکا ہے۔ لٹیکے لٹ۔ اب میں نہ مانو گی۔  
 یہ کہہ کر وہ اٹھی اور منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 منشی جی۔ ایسی کیا ہرنی ہے۔ لٹ پھیلے لیتی ہو۔  
 سو سیلا۔ زبان ہنس دی تھی۔ ابھی سے مگر لے لے۔  
 منشی جی۔ تم نے بوجھا بھی؟ صاف دھوکا کھا گئیں۔  
 سو سیلا۔ چلو چلو بہانہ کرتے ہو۔ لٹ، مضمہ کرنے کی نیت ہے۔ کیل لٹو یہ  
 تمہارا ہی خط ہے نہ؟  
 پرتاپ نے بخچی نگاہوں سے منشی جی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے لولا  
 ”میں نے کہاں لکھا؟“  
 منشی جی۔ بشر ماؤ مشر ماؤ۔  
 سو سیلا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اُسی کا خط ہے۔ تملوک آپ میں گھسکر آئے ہو۔  
 پرتاپ۔ میرا خط نہیں ہے۔ سچ۔ برجن نے لکھا ہے۔  
 سو سیلا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”برجن کا“ اور اُس نے دُڑ کر شہر  
 کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور بھوپک ہر کر لے دیکھنے لگی مگر اب بھی یقین نہ آیا  
 برجن سے پوچھا ”کیوں بیٹی یہ تمہارا لکھا ہے۔ برجن نے تمہکا کر کہا“ ہاں ”یہ شنتی  
 ماں نے اُسے گلے لگایا۔ اب آج سے برجن کا یہ حال ہو گیا کہ جب دیکھنے فلدا ان  
 لے بیٹی ہے اور کاغذ سیاہ کر رہی ہے۔ گھر کے کام دھندے سے تو اسے پہلے ہی سے

کچھ سروکار نہ تھا۔ لکھنے کا آنا سونے پر بہانہ ہو گیا۔ ماں اس کی مصروفیت دیکھ  
دیکھ کر خوش ہوتی۔ باپ بچھو لائے سماتا۔ بہن نہی کہتا ہیں لانا کہ برجن ہر شیار ہو  
جائیں تو پڑھیں گی۔ اگر وہ کبھی اپنا پیر آپ دھو لیتی یا کھانا کھا کر آپ ہی ہاتھ دھوئے  
لگتی تو ماں مہر لیں پر برس پڑتی تھیں بچھوٹ گئی ہیں۔ جوبی چھا گئی ہے۔ واپس  
ہاتھ سے پانی انڈیل رہی ہے اور تم کھری منہ تاکتی ہو۔

اسی طرح دن گزرتے چلے گئے۔ برجن کا بارھواں سال پورا ہوا مگر ابھی تک  
اُسے چادل اُبالنے کا شعور نہ تھا۔ بچو لمحے کے سامنے بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں  
ہوا۔ شہما نے ایک دن اُس کی ماں سے کہا: ”بہن برجن سیلائی ہوئی کیا  
کچھ کن ڈھنگ نہ سکھاؤ گی؟“

سو سیلا کیا کہیں بچی تو چاہتا ہے کہ لگا لگاؤں مگر کچھ سوچکر رہ جاتی ہوں۔  
شہما۔ کیا سوچکر رہ جاتی ہو؟

سو سیلا۔ کچھ نہیں۔ اُلکس آ جاتا ہے۔

شہما۔ تو یہ کام میرے سپرد کر دو۔ کھانا پکانا عورتوں کے لئے سب سے ضروری  
بات ہے۔

سو سیلا۔ ابھی چو لمحے کے سامنے اُس سے بیٹھانہ جائیگا۔

شہما۔ کام کرنے ہی سے آتا ہے۔

سو سیلا۔ (چھینٹتے ہوئے) پھول سے گال کھلا جائیں گے۔

شہما۔ (منہ سکر) بلا پھول کے مڑھائے کہیں پھل لگا ہے؟  
دوسرے دن سے برجن کھانا پکانے لگی پہلے دس پانچ دن اُسے چو لمحے

کے سامنے بیٹھنے میں سخت تکلیف ہوئی، لگ نہ جلتی۔ چھوکنے لگتی تو آنکھوں سے پانی بہتا۔ وہ بونی کی طرح لال ہو جاتیں۔ چونگاریوں سے کئی ریشمی ساڑیاں استیانس ہو گئیں۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے مگر رفتہ رفتہ یہ سب مصیبتیں رفع ہو گئیں۔ سبانا ایسی نیک مزاج عورت تھی کہ کبھی ناراض نہ ہوئی۔ ہمیشہ چمکا کر اسے کام میں لگائے رہتی۔

ابھی برجن کو کھانا پکاتے دو باہ سے زیادہ نہ گزے ہوئے کہ ایک دن اُس نے پرتاپ سے کہا۔ ”لو مجھے کھانا پکانا لگیا۔“

پرتاپ۔ سچ! سچ! کل جچی نے میرا پکھانا کھایا تھا۔ بہت خوش ہوئیں۔  
پرتاپ۔ تو بھی ایک دن میری بھی دعوت کرو۔  
برجن۔ (خوش ہو کر) اچھا کل۔

دوسرے دن نو بجے برجن نے پرتاپ کو کھانے کے لئے بلایا۔ اُس نے جا کر دیکھا تو چوکا لگا ہوا ہے۔ تازی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبودار ہی ہے۔ اس عصفائی سے بچھا ہوا ہے۔ ایک تھالی میں چائیل اور چپائیاں ہیں۔ ال اور ترکاریاں الگ الگ کٹوروں میں رکھی ہوئی ہیں۔ لوٹا اور گلاس پانی سے بھرا ہوا موجود ہے۔ یہ عصفائی اور سلیفہ دیکھ کر پرتاپ سیدھا دوڑا ہوا غشتی سمیون لال کے پاس گیا۔ اور انہیں لاکر چوکے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ غشتی جی فرط مسرت سے اُپھل پڑے چٹ کپڑے اُتار ہاتھ پیر دھو پرتاپ کے ساتھ چوکے میں جا بیٹھے۔ بیچاری برجن کو کیا معلوم تھا کہ یہ حضرت بھی بن بلائے ہمارے ہو جائیں گے۔ اُس نے صرف

پر تپا پ کے لئے کھانا بنایا تھا۔ اس وقت بہت شرمائی اور نیچی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ سو سبیلہ تار گئی، مسکرا کر منشی جی سے بولی، ”تمہارے لئے کھانا تیار ہے۔ لڑکوں کے بیچ میں کیا آکے کوڈ پڑے۔“

برج رانی نے شرماتے ہوئے دو تھالیوں میں تھوڑا تھوڑا کھانا پرسا۔  
منشی جی برج نے چپائیاں خوب بنائی ہیں۔ نرم۔ سفید اور میٹھی۔

پر تپا پ۔ چاول دیکھئے، بکھرا دوا اور چرن لو۔

منشی جی۔ میں نے ایسی چپائیاں کبھی نہیں کھائیں۔ سالن بہت لذیذ ہے۔

پر تپا پ۔ برج! چچا کو شوریلے دانہ لادو۔

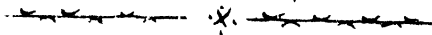
یہ کہہ کر ہنسنے لگا، برج نے جاکر سر نیچا کر لیا۔ بٹلی خشک ہند می تھی۔

سو سبیلہ (شوہر سے) اب اٹھو گے بھی؟ ساری رسوائیں چٹ کر گئے اور ابھی اڑے بیٹھے ہو۔

منشی جی۔ کیا تمہاری رال ٹپک رہی ہے۔

ہنسر دونوں آدمی رسوائیں کا صفایا کر کے اٹھے منشی جی نے اُسی وقت

ایک انشرفی نکال کر برج کو انعام دی؟



## ڈپٹی شیاماچرن

ڈپٹی شیاماچرن کا رعب سارے شہر برطانی تھا۔ شہر میں کوئی ایسا حاکم نہ تھا۔ جسکی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں۔ اس کا باعث کچھ تو یہ تھا۔ کہ وہ مزاج کے بہت خلیق اور حلیم تھے اور کچھ یہ کہ رشوت سے انہیں قطعی احتراز تھا۔ منصفانہ نگاہ ایسی باریک تھی کہ دس بارہ برس کے عرصہ میں مشکل سے ان کے دو چار فیصلوں کی اپیل ہوئی ہوگی۔ انگریزی کا ایک حوت نہ جانتے تھے مگر اچھے اچھے بیرسٹروں اور وکیلوں کی بھی ان کی قانونی دستگاہ اور نکتہ رسی پر حیرت ہوتی تھی۔ مزاج میں آساؤ پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مکان اور پکڑی کے سوا کسی نے انہیں اور کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ منشی سالگ لاس جہتک زندہ یا دیوں کہو کہ موجود تھے تو کبھی کبھی ان کے یہاں تفریحاً چلے جاتے تھے۔ جب سے وہ لاہور ہوئے ڈپٹی صاحب نے گھر چھوڑ کر بننے کی قسم کھالی کہی۔ برس ہوئے ایک بار کلکٹر صاحب کے سلام کو حاضر ہوئے تھے۔ خانہ سالانے کہا صاحب غسل کر رہے ہیں۔ دو گھنٹہ تک برآمدے میں ایک مونڈھے پر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد صاحب بہادر ہاتھ میں ایک ٹینس میٹ لئے ہوئے نکلے اور محدث کے طور پر کہا۔ ”بالا صاحب ہم کو بہت افسوس ہے کہ آپکو ہمارا راہ دیکھنا پڑا۔ ہم کو آج فرصت نہیں ہے کلب گھر جانا ہے۔“

آپ پھر کبھی آویں۔“ یہ سنکر انہوں نے صاحب بہادر کو فرشی سلام کیا اور اتنی سی بات پر پھر کسی انگریز کی ملاقات کو نہ گئے۔

بالوشیا ماچرن اگرچہ کسی معنی میں حرلیں شہرت نہ تھے مگر اپنے نام ایک کویدی کی ہوا سے پچلتے رہتے تھے خانہ دانی اعزاد اور دجاہت پر بھی انہیں کسی قدر عزت تھا۔ اپنی وضع کے وہ بڑے رنگین مزاج آدمی تھے ان کی باتیں ظرافت سے بھری ہوتی تھیں۔ شام کے وقت جب وہ چند منتخب جناب کے ساتھ معنی میں بیٹھتے تو ان کے قبضہ کی کوکھ جی ہوئی آواز یا غیجہ سے سنائی دیتی تھی۔ نوکر وں چاکروں سے وہ بہت بے تکلفی کا برتاؤ رکھتے۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ اللہ کے گرد بیٹھنے سے بھی عار نہ تھا۔ مگر ان کا رعب کچھ ایسا اچھا یا ہوا تھا کہ کسی کو ان کی ان کمزوریوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کی ہرأت نہ ہو سکتی تھی۔ وضع قطع سادہ رکھتے کوٹ پتلین سے انہیں نفرت تھی۔ بٹن داساؤ پچی اچکین۔ اس پر ایک ریشمی کام کی عبا۔ سیاہ شملہ۔ ڈھیلے پا جامہ اور دلی کی ساخت کا نوکدار جوتا۔ ان کی خاص وضع تھی۔ اور ان کے دوہرے بدن۔ سرخ و سفید چہرہ اور درمیانہ قد پر جس قدر یہ لباس زیب دیتا تھا۔ اتنا کوٹ پتلین سے ممکن نہ تھا۔

مگر ڈپٹی شیا ماچرن کا رعب چاہے سالے شہر میں چھایا جاتا۔ خود اپنے گھر کی چہرہ دیواری کے اندر ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ یہاں مسٹر شیا ماچرن کی عملداری تھی اور وہ اپنے ممالک محروسہ میں مطلق العنانی کے ساتھ راج کرتی تھیں نوکر وں کا تقرب۔ ان کی برخاستگی۔ ان کی سزا خانگی ضروریات۔ لین دین۔ غرض ان کی ہوا میں انہیں سیاہ و سفید کا اختیار تھا۔ کئی برس گزرے ڈپٹی صاحب نے

پریم دتی کی مرضی کے خلاف ایک مہراجن کو کرکھولی تھی۔ مہراجن ذرا نگیلی تھی۔ پریم دتی اپنے شہر میں اس مداخلت پر ایسی برہم ہوئی کہ مفتوں تک کوپ بھون میں بیٹھی رہی۔ آخر صبح ہو کر ڈپٹی صاحب نے مہراجن کو رخصت کر دیا۔ تب سے انہیں پھر خانگی معاملات میں رخنہ ڈالنے کی کبھی ہمت نہ پڑی۔ حالانکہ بیچارے بہت متنی اور پاک نفس آدمی تھے اور اب سن بھی چالیس سے تجاوز نہ ہو گیا تھا۔ مگر پریم دتی کے دل میں ابھی تک ان کی جانب سے بدگمانی بنی ہوئی تھی۔ اُس کا مزاج خلعتہ نگمانہ واقع ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے جھوٹی دشمنی اور بڑے بول سے سخت نفرت تھی جب کبھی وہ شہر میں کسی کے یہاں تقریبوں میں شریک ہونے کیلئے جاتی تو گویا یہ مسلمہ بات تھی کہ وہاں بد مزگی صوبہ بیاہوگی۔ عورتوں کو بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے دیکھ کر اُس سے ضبط نہ ہوتا۔ برس پڑتی امر حق کے اظہار سے وہ کبھی نہ چوکتی۔ چاہے اس کی پاداش میں اُسے تو کوئی میں بھی کیوں نہ کرنا پڑے اور طعنوں کے تیر چیمونے میں تو اُسے خاص ملکہ تھا۔

منشی جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا لڑکا رادھا چرن پچھلے سال دگری حاصل کر کے اس وقت رُڈ کی کلج میں پڑھتا تھا۔ اُس کی شادی فچہور سیکری کے ایک رئیس کے یہاں ہوئی تھی منجھلی لڑکی کا نام سیوتی تھا۔ اُس کی شادی بھی الہ آباد کے ایک متمول گھرانے میں ہو گئی تھی۔ چھوٹا لڑکا مکلا چرن ابھی تائب بن بیاہا تھا۔ پریم دتی نے پچھلے ہی سے لڈ بیاہ کر کے اُسے ایسا بیاہک اور بدشوق بنا دیا تھا۔ کہ اس کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف ذرا بھی نہ مائل ہوتی۔ پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک سیدھا سا خط لکھنے کی بھی ہیر نہ تھی۔ میاں

جی کے بیٹھے۔ انہیں اُس نے ہمینہ بھر کے اندر نکال کر دم لیا۔ تب مدستے میں نام لکھایا گیا۔ وہاں جاتے ہی اُسے بجا کر چڑھ آتا۔ درد سر شروع ہو جاتا۔ اس لئے وہاں سے بھی اُٹھا لیا۔ تب ایک ماسٹر صاحب آنا لیتی پر مامور ہوئے۔ مگر اُن کے تین مہینہ کی دوران ملازمت میں کمالا چرن لے مشکل سے تین سبق پڑھے ہوئے۔ آخر ماسٹر صاحب بھی رخصت ہوئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے خود پڑھانے کی ٹھانی۔ مگر ایک ہی ہفتہ میں انہیں کئی بار کمالا کا سر ہلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گو اہل کے بیانات اور دکھانے کی ہر جگہ کی نہ تک پہنچنا آنا مشکل نہیں ہے جتنا کسی بدشوق لڑکے کے دل میں تعلیم کی رغبت پیدا کرنا پریم دتی نے اس مار دھار پر ایسی داد فریاد چلائی کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بھی جھکا کر چھوڑ دیا۔ کمالا کچھ ایسا قبول صورت۔ ایسا نامک بلن اور شیریں زبان تھا۔ کہ مال اُسے سب لڑکوں سے زیادہ چاہتی۔ اس کی ناز برداریوں نے کمالا کو کنکوے بازی۔ کموتز بازی اور اسی قبیل کے دوسرے متاعل کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ صبح ہوئی۔ اور کموتز اڑائے جانے لگے۔ شیریں کے جوڑ چھوٹے لگے۔ شام ہوئی اور کنکوے کے طے لمبے پیچ ہونے لگے۔ کچھ دنوں سے جوئے کا چسکا بھی پڑ چلا تھا۔ آئینہ کنگھی اور عطریل میں تو گویا اُسکی جان بستی تھی۔ رین ابھی بچہ نہ تھا مگر شہدوں کے فیض صحبت سے نظر بازی میں بھی شہرہ آفاق تھے۔

پریم دتی ایک دن سہلا سے ملنے گئی ہوئی تھی وہاں اُس نے برج رانی کو دیکھا اور اُسی دن سے اُسکا جی الجایا ہوا تھا کہ اگر یہ بہو بنکر میرے گھر میں آئے تو گھر کے بھاگ بھاگ اٹھیں۔ ایک ماہ داں عورت کے ذریعے سے سو بیلا



یہ اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ برہن کو تیرہ صواں سال شروع ہو چکا تھا۔ میاں بیوی میں  
شادی کے متعلق صلاح و مشورہ ہو رہا تھا۔ پریم ونی کا عندیہ پاکر دولہا  
پھولے نہ سمائے۔ ایک تو جاننا بہیمان کے آدمی۔ پھر علی خاندان۔ لڑکا ذہین  
اور تعلیم یافتہ موروثی حامد اکثر۔ اگر ان سے ناٹھ ہو جائے تو کیا پوچھنا بچٹ  
پٹ باقاعدہ طور پر پیغام کہلا بھیجا۔ اس طرح اتفاقاً اس نے آج اس نہریلے  
درخت کا بیج پودیا جس نے تیس ہی برس میں خاندان کا خاندان تباہ کر دیا۔  
مستقبل ہماری نگاہوں سے کیسا پوشیدہ رہتا ہے۔

جوں ہی پیغام پہنچا پریم ونی چھٹی نہ سمائی۔ اس ننھا دیہاتیوں ملتے ہوئے  
بہو۔ (چندرا) کیوں اتنا کیا آپدسی سال بیاہ کریں گی؟  
پریم ونی: اور کیا تمہارے للہ جی کے ماننے کی دیر ہے۔  
بہو۔ کچھ تک جیسز بھی ٹھہرا؟

پریم ونی: تک چیز ایسی (کیوں) کے لئے نہیں ٹھہرا یا جاتا۔ جب ترلو میں لڑکی لڑکے  
کے برابر نہیں ٹھہرتی تب جیسز کا پاسنگ بنا کر اسے برابر کر دیتے ہیں۔ ہماری  
برج رانی کلاس سے بہت بھاری ہے۔

سیوٹی: کچھ دنوں گھر میں خوب چہل پہل ہو گی۔ بھائی گیت گائیں گی۔ عین ڈھلک  
بجائیں گی۔ کیوں بھابی؟

چندرا: مجھے ناچنا گانا نہیں آتا؟

چندرا کی آواز بھاری تھی۔ جب گاتی تو راگ میں بے سراسر آجاتا۔ اس  
لئے اسے گانے سے چڑھتی۔

سیوٹی۔ یہ تو تم آپ ہی کہو۔ تمہارے گالے کی منسا میں دھوم ہے۔  
چند راجل لکٹی جیسکی ہو کر بولی:۔ ”جیسے نالچ گا کر دوسروں کو لٹھانا ہو۔  
ناچنا گانا سیکھے“

سیوٹی۔ تم ذرا اسی دل لگی میں اندھن ہو جاتی ہو۔ خدا وہی گیت گاؤ۔ ”تم تو شیام  
بڑے بے کھر ہو۔“ اسوقت سننے کو بہت جی چاہتا ہے۔ وہ نہیں ہے  
تمہارا گانا نہیں سنا۔

چند را۔ تمہیں گاؤ۔ تمہارا گلہ کہ تلوں کا سا ہے  
سیوٹی۔ لے اب تمہاری یہی شہادت اچھی نہیں لگتی۔ میری بھائی ذرا گاؤ۔  
چند را۔ میں اسوقت ہرگز نہ گاؤں گی۔ کیا مجھے کوئی دُمنی مقرر کیا ہے؟  
سیوٹی۔ میں تو بلا گیت سننے آج تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گی  
سیوٹی کی آواز نہایت دلکش اور سُریلی تھی۔ خدو حال بھی دلفریب۔  
چمپئی رنگ۔ سبیلی آنکھیں۔ پیاز کی رنگ کی ساڑی اس پر خوب کھل رہی تھی۔  
آپ ہی آپ گالے لگی:۔

تم تو شیام.....  
میری نپائی پر گجر۔ پانی پر گجر  
آپ تو شیام.....  
تم تو شیام.....

دھدھ کے کلہڑ۔ بولے اختیار ہنس پڑی۔ پریمی بھی مسکرائی۔ مگر چند را  
رہانسی ہو گئی۔ بولی۔ ”بلا ہنسی کی ہنسی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس میں ہنسنے  
کی کیا بات ہے؟“

سیبوتی۔ اوہم تم ملکہ گائیں۔  
 چندرا۔ کوئل اور چیل کا کیا ساتھ۔  
 سیبوتی۔ غصہ تمہاری ناک پر رہتا ہے۔  
 چندرا۔ تو ہمیں کیوں چھیڑتی ہو؟ ہمیں گانا نہیں آتا۔ تو کوئی تم سے شکایت کرنے تو  
 نہیں جلتا۔

”کوئی“ کا اشتادہ رادھا چرن کی طرف تھا۔ چندرا میں چاہے اور کوئی گن نہ  
 ہو مگر شوہر کی خدمت دل و جان کئی تھی۔ انکا ذرا سرد صمکا اور اسکی جان بکلی  
 اُلٹو گھڑانے میں ذرا دیر ہوئی اور یہ پتھر ہونے لگی۔ جس سے وہ رڑکی چلے گئے۔ تب سے  
 چندرا کا ہنسنا بولنا سب چھوٹ گیا۔ اسکی خوشی انکے ساتھ چلی گئی تھی۔ انہیں  
 باتوں نے رادھا چرن کو یہی کاشیدار بنا دیا تھا جسٹن اور سلیفہ اور گن یہ سب محبت کے  
 مقابلے میں امتثال چیزیں ہیں۔ محبت جسٹن اور سلیفہ اور گن کی سب کامیاں پوری کر دیتی ہے  
 سیبوتی۔ شکایت کیوں کریگا کوئی تو تم پر دل و جان سے رکھا ہوا ہے۔

چندرا۔ ادھر کئی دن سے خط نہیں آیا۔

سیبوتی۔ تین چار دن ہوئے ہونگے۔

چندرا۔ تم سے ہاتھ پیر جڑ کے ہار گئی۔ تم لکھتی ہی نہیں۔

سیبوتی۔ اب وہی باتیں روز روز کون لکھے۔ کوئی نئی بات ہو تو لکھنے کا جی چاہے۔

چندرا۔ آج شادی کا حال لکھ دینا۔ لاؤں قلم دوات۔

سیبوتی۔ مگر ایک شرط پر لکھ دنگی۔

چندرا۔ بتاؤ۔

سیوٹی۔ تمہیں شام والا گیت گانا پڑے گا۔  
 چندرا۔ اچھا گا دو گی۔ ہنسنے ہی کا جی چاہتا ہے مہ؟ ہنس لینا۔  
 سیوٹی۔ پہلے گا دو تو لکھیں۔  
 چندرا۔ نہ لکھو گی۔ پھر باتیں بنانے لگو گی۔  
 سیوٹی۔ تمہاری ستم لکھ دو گی۔ نکاؤ۔  
 چندرا گانے لگی۔  
 تم تو شام پیو دودھ کے کلہڑ  
 میری تو پانی پے گجر پانی پے گجر ہو۔  
 تم تو شام بڑے بے کھر ہو۔  
 آخری الفاظ کچھ اس بے سرے پن سے نکلتے تھے کہ تنہی کا ضبط کرنا محال  
 تھا۔ سیوٹی نے بہت رنکا مگر تنہی نہ رنک سکی۔ ہنسنے ہنسنے پیٹ میں ہان پڑ گئی۔  
 چندرا نے دوسرا بند گایا۔  
 آپ تو شام رکھ دو دو لغیاں لا لگائیں  
 میری تو اچی پے پے بحر۔ اپنی پے بحر ہو  
 تم تو شام...  
 لغیاں پر سیوٹی ہنسنے ہنسنے لوٹ گئی۔ چندرا نے ابدیدہ ہو کر کہا۔ اب تو خوب  
 ہنس چکیں۔ لالہ قلم دوات؟۔  
 سیوٹی۔ تمہیں نہیں۔ ابھی ذرا ہنس لینے دو۔  
 سیوٹی ہنس ہی رہی تھی کہ بالہ مکمل چلن باہر سے تشریف لائے۔ چندرا سر  
 کا سن تھا۔ گدا گدا رنگ۔ چھر بیاہلن۔ خوشنود۔ چھو نود۔ پرتکلف پوشاک زیب تن  
 کئے۔ غطریں بسے۔ آنکھیں میں سرمہ۔ لبوں پر مسکراہٹ ادا تھیں بلبل۔ آکر چل پائی پڑھ

گئے سیلوئی ہولی کلو منہ میٹھا کراؤ تو تمہیں خوشخبری سنائیں۔ سننے ہی پھر اٹھو۔  
 کھلا۔ منہ تو تمہارا آج ضرور میٹھا ہوگا۔ چاہے خوشخبری سنو یا نہ سنو۔ آج اس شہر  
 نوحہ میدان مار رہے کہ باید و شاید۔  
 یہ کہہ کر کھلا چون نے بلبل کو اٹھوٹھے پر بٹھالیا۔  
 سیلوئی۔ میری خبر سننے ہی ناچنے لگو گئے۔

کھلا۔ تو بہتر ہے آپ نہ سنائیے۔ میں تو آج یہی ناچ رہا ہوں۔ اس شیر نے آج ناک کھ  
 لی مسلا شہر ہوگ رہا۔ نیاب منے حال بہت دھول سے اینجاب کی آنکھیں پر چڑھے ہو  
 تھے۔ ایک مہینہ ہوتا ہی اُسے سے نکلا تو آپ فرماتے لگے میاں کوئی پٹھا تیار ہو تو لاؤ۔  
 دو چوچیں ہر جائیں۔ یہ کہہ کر اپنے امانا بلبل دکھایا۔ میں نے عرض کیا۔ بندہ ہوں۔  
 ابھی تو نہیں مگر ایک مہینہ میں لاشا اللہ آپ سے خود ایک چوہ ہوگی اور بددکر۔ آج آغا  
 شیر علی کے لکھائے میں بدان کی ٹھہری۔ پچاس پچاس روپیسی بازی تھی۔ لاکھوں آدمی جمع  
 تھے۔ خواب صاحب بلبل جہانگیر سے یقین مانو سیلوئی۔ کجنت کہتے کے برابر تھا۔ مگر جو وقت  
 یہ پٹھا چلا ہے تو اسکی اٹھی ہوتی اگر دن مستانہ چال اور کھیلے پن پر لوگ واہ واہ کرنے لگے جاتے  
 ہی جاتے اس نے اسکا بیٹو الیا۔ مگر وہ بھی محض پھولتہ تھا۔ سالے شہر کے بلبل کو سر کے  
 جوئے۔ زود سے ملت چلائی اس نے خالی دی لاو پھر چھٹ کر اسکی چوٹی ڈہانی ماس پھر  
 چوٹ کی۔ سینے پر کیا چوڑے غل غل گیا مار لیا۔ تب تو اینجاب کو بھی غصہ کیا۔ ڈنٹ  
 کر جو ملکات، ہل تھپ اوپر اودھ نیچے دبا ہوا۔ پھر تو اس نے ہزار ہزار سر ہکا کہ لہو پر کہا  
 مگر اس شیر نے ایسا دایا کہ سر نہ اٹھائے دیا۔ ذاب صاحب خود موجود تھے۔ بہت چٹنے  
 چلاتے مگر کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے اسے ایسا دلو ہا تھا جیسے باز پتی کو آخر کجنت

بھاگا۔ اُس نے پانی کے اُس سرے تک پہنچا کیا مگر تیر پا سکا لوگ حیرتے رنگ رہ گئے۔ نو اب صاحب کا تو چہرہ فن ہو گیا۔ ہوائیاں اُٹنے لگیں۔ روپیہ ہارنے کی تو انہیں کچھ پروا نہیں لکھوں کی آمدنی نہ ہے مگر شہر میں جھانکی دھاک بندھی ہوئی تھی وہ جاتی رہی روٹے ہوئے گھر کو سدھارے۔ سنتا ہوں یہاں سے جاتے ہی بچے بلبل کو زندہ دفن کر دیا۔  
یہ کہہ کر کملا چرن نے جیب کھینکھائی۔

سیلوتی۔۔۔ تو پھر کھڑے کیا کر رہے ہو۔ آگرہ والے کی دکان پر آدمی بھیجو۔  
کملا۔ تمہارے لئے کیا لائن بھابی ؟

سیلوتی۔۔۔ دنگھ کے کلٹر۔

کملا۔ اور پھیلا کے لئے ؟

سیلوتی۔۔۔ دو دو لٹیاں۔

یہ کہہ کر دونوں قہقہہ لگانے لگے۔

## سرد مہری محبت کو بھلا نہیں سکتی

شہ بلا دل فیماں سے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ صبح سے شام تک شادی ہی کے دھندلے ہیں ابھی ترقی سوسیلہ بورڈ کی طرح اسکے حکم کی تعمیل کیا کرتی۔ منشی سمیع اللہ صبح سے شام تک بانڈر کی خاک چھلنے پھٹنے اور بچن چکے لئے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی رات دن رویا کرتی تھی۔ کسی کو اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ دم بھر کو اس کا دل پہلے لے۔ یہاں تک کہ برتاپ بھی اب اسکی صورت سے بیزار نظر آتا۔ وہ بہت اداس رہتا تھا۔ سویرے کا نکلا ہوا شام کو گھر آنا اور اپنی منڈیر پر چپ چاپ جا بیٹھنا۔ بچن کے گھر جانے کی تو اس لئے قسم ہی کھالی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ آتی ہوئی دکھائی دیتی تو چپکے سے سرک جاتا۔ یا اگر کہنے سننے سے بیٹھتا بھی تو کچھ اس طرح منہ پھیر لیتا اور ایسی خفگی سے پیش آتا کہ بچن رونے لگتی اور شہلا سے جاکر کہتی: بچی لکھ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں ملتی ہوں نہیں بولتے تم جھکنا۔ وہ کہہ کر وہ چل جاتی اور شہلا کا آجکل پکڑ کر کھینچتی ہوئی برتاپ کے گھر لاتی۔ جیسے کوئی فریادی اپنے سناٹے کو ساتھ لے کر برتاپ دونوں کو دیکھتے ہی نکل جھگڑا۔ بھج رانی : مدد نہ نکال سکتے تھے۔ یہ کہتی ہوئی آتی۔ کہ لکھو ذرا سن لو۔ ذرا سن لو۔ تمہیں بتا رہی ہوں کہ ذرا سن لو۔ مگر جب نہ سننا اور نہ منہ پھیر کر دیکھنا تو بیچاری بڑی زمین پر بیٹھ جاتی اور خوب پھوٹ پھوٹ کے روتی اور کہتی۔ یہ مجھ سے کیوں روئے ہوئے ہیں میں

نے تو انہیں کبھی کچھ نہیں کہا۔ سُباما اسے سینے سے لگا لیتی اور سمجھاتی جیٹی جانے دو۔ لالہ پاگل ہو گیا ہے۔ اُسے بیٹے کی اس سرد مہری کا انداز معلوم ہو چلا تھا۔

آخر مشادی کو صوف پانچ دن لے گئے۔ عمرزو و اقا اب دور و نزدیک سے آنے لگے۔ برون کو باہر نکلنے کی مخالفت ہو گئی۔ کنگن بندھ گیا۔ آنگن میں خوبصورت مسندا اچھا گیا۔ یہ کچے دھانگے کا کنگن پاک فخر القی کی ہتھکڑی ہے جو کبھی ہاتھ سے نہ نکلیں گی۔ ادھر مسندا اس محبت و شفقت کے سایہ کی یادگار ہے جو مرتے دم تک سر سے نہ اٹھے گا۔ آج شام کو سُباما سو سیلا۔ جہراحین سب کی سب بلکہ دیوی جی کی پوہا کرنے گئیں۔ مہریاں اپنے دھندلے میں لگی ہوئی تھیں۔ برون گھبرا کر اپنے کمرے سے نکلی اور پرتاپ کے گھر گم پہنچی۔ جو طرہ سناٹا بھایا ہوا تھا۔ صوف پرتاپ کے کمرے میں دھندلی روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ برون کمرے میں داخل ہوئی مگر کیا دیکھتی ہے کہ میز پر لمپیپ روشن ہے اور پرتاپ ایک کھری چارپائی پر پڑا سو رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ بہت چمکندہ اور مغموں نظر آتا تھا۔ چیزیں سب ادھر ادھر بے قرینہ پڑی ہوئی ہیں۔ فرش پر مٹوں گرد جمع ہو گئی ہے۔ کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ البسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرہ کو کسی نے بہتیں سے نہیں کھولا۔ یہی ہوتا ہے جو صفائی بُرجان دیتا تھا برون نے جاپا اُسے جنگا دلوں۔ مگر پھر کچھ سوچکر زمین سے کتابیں اٹھا اٹھا الماریوں میں رکھنے لگی۔ نیز پر سے گرد بھاڑی۔ تصویروں کے کٹنے پر سے گرد کی نقاب اٹھائی۔ دفعتاً پرتاپ نے کمرہ ڈھکی۔ اب اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔ ”برجن میں بہتیں نہیں بھول سکتا۔“ پھر زاد پر کے بعد برون برون کہاں جاتی ہو یہیں بیٹھو۔“ پھر کمرہ ڈھکی۔ ”نہ بیٹھو گی۔ اچھا جاؤ۔ میں تم سے نہ بولونگا۔“ پھر زاد پھر کر۔ ”اچھا جاؤ دیکھیں کہاں جاتی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ لپک لپک جیسے کسی



بھاگتے ہوئے آدمی کو پکڑ رہا ہو۔ برجن کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی  
 آنکھیں کھل گئیں۔ ایک منٹ تک اُس کی بے معنی نگاہیں برجن کے چہرہ پر گڑی  
 رہیں۔ پھر چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر برجن کا ہاتھ چھوڑ کر بولا۔ ”تم کب آئیں برجن؟“  
 میں ابھی تمہارا خواب دیکھ رہا تھا“

برجن نے بولنا چاہا مگر گلا روک دیا گیا۔ اور آنکھیں بھرا آئیں۔ پرتاپ نے ادھر  
 ادھر نظر دوڑا کر پھر کہا۔ ”کیا یہ سب تم نے صاف کیا۔ تمہیں بڑی تکلیف ہوئی؟“  
 برجن نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

پرتاپ۔ برجن۔ تم مجھے بھول کیوں نہیں جانتیں؟  
 برجن نے پُچھا۔ ”کیا تم مجھے بھول گئے؟“  
 پرتاپ نے دوسرے ہو کر سر جھکا لیا

تھوڑی دیر تک دونوں خیالات سے بھرے زمین کی طرف تکتے رہے پھر برجن  
 نے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیوں ناراض ہو میں نے کئی خطا کی ہے؟“  
 پرتاپ۔ نہ جملے کیوں اب تمہیں دیکھتا ہوں۔ توجہ چاہتا ہے۔ کہ کہیں چلا  
 جاؤں۔

برجن۔ کیا تم کو میری ذرا بھی محبت نہیں معلوم ہوتی۔ میں دن بھر رو با کرتی ہوں۔  
 تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا۔ تم مجھ سے بولتے تک نہیں بتلاؤ میں نے تمہیں  
 کیا کہا کہ تم اتنا روکھ گئے۔

پرتاپ۔ میں تم سے روکھا تھوڑے ہی ہوں۔  
 برجن۔ تو مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟

پرتاب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھول جاؤں تم امیر ہو۔ تمہارے مل باپ  
 امیر ہیں۔ میں یتیم ہوں۔ میرا تمہارا کیا ساتھ؟  
 برجن۔ اب تک تو تم نے کبھی یہ جملہ نہیں نکالا تھا۔ کیا اب میں نیلادہ امیر ہو گئی؟  
 یہ کہہ کر برجن رونے لگی۔ پرتاب بھی سیخا۔ بوللا۔ ”برجن ہمارا تمہارا بہت  
 دلوں تک ساتھ رہا۔ اب بچھڑنے کے دن آگئے۔ چند دن میں تم یہاں والوں کو  
 چھوڑ کر اپنے سسرال چلی جاؤ گی۔ اس وقت مجھے ضرور ہی بھول جاؤ گی۔ اس  
 لئے میں بھی چاہتا ہوں تمہیں بھول جاؤں۔ مگر کتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمہاری باتیں  
 یاد نہ آئیں۔ وہ نہیں مانتیں۔ ابھی سووتے سووتے تمہارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا۔

---

ڈپٹی شیاماچرن کامکان آج حسینوں کے جھگڑے اند کا اکھاڑہ بنا ہوا  
 تھا۔ سیوٹی کی چار ہیلیاں رکنی سیتا۔ رام دیہی چندر کنور سولہل سنگا کے اٹھارے  
 پھرتی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کی بہن جاکلی کنور بھی اپنی دوڑ لگیوں کے ساتھ آمادہ سے سرگئی  
 تھیں۔ ان دونوں کا نام کھلا اور ادا دیٹی تھا۔ کھلا کا بیلا ہو چکا تھا۔ ادا دیٹی ابھی کنواری  
 تھی۔ دونوں آفتاب مہتاب منڈیکے تلے دو دنیاں اڈو گاٹیں سہاگ اور سہرا لاپ ہی تھیں  
 گلبیا نان اور جینی بابر فلوں شوخ رنگ کی ساتیاں پہنے۔ نانگ سیندر بھڑائے۔ گلبیکے  
 کڑے پہنے جھم کچم کرتی پھرتی تھیں۔ گلبیا شوخ و شنگ آٹھ زونان تھی۔ جینی کا سن دھل چکا تھا  
 سیوٹی کا کیا پوچھا آج اس پر غضب کھار تھا۔ سیلی آنکھیں فوط بستر سے متوالی ہوتی تھیں  
 اور گلبی ساڑی کی جھلک سے چمپٹی رنگ گلبی نظر آتا تھا۔ ہانی محل کی کرتی اس پر خوب کھلتی تھی  
 ابھی نہا کر آئی تھی اسلئے ناگن کی سی لیٹیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ چھیر بھاڑ اور چہل سے اتنی  
 فرصت بھی ملتی تھی کہ ذرا بال گوندھ لے۔ گیسے باہر سناڑھا کر رہا تھا۔ ہاتھوں میں صرف  
 کڑے تھے۔ یہ سولہ لگا اُس پر سر اندر پودل سے زیادہ زیب تھی۔ مہراجن کی بیٹی مادھوی  
 چھینٹ کا لچکدار لہنگ پہنے۔ آنکھوں میں کاہل لگائے اندھا ہر ایک کے ہٹتے تھے۔  
 رکنی نے سیوٹی سے کہا۔ ”ستو تمہاری بھادوچ کہاں ہیں دکھائی نہیں دیتیں  
 کیا ہم لوگوں سے بھی پردہ ہے؟“

رام دیٹی۔ (مسکرا کر) پردہ کیوں نہیں ہماوی نظر نہ لگیا بیگی۔  
 سیوٹی۔ کمرو میں پڑی سو رہی ہو گی دیکھو ابھی کھینچے لائی ہوں۔  
 یہ کہہ کر وہ چندرا کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ ایک مہتری سی ساڑی پہنے۔ چابھائی پر  
 پڑی دو اداؤ کی طرف نمٹنے لگی لگائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ سیوٹی نے  
 کہا۔ ”یہاں پڑی ہو۔ کیلے تمہارا جی نہیں گھبراتا؟“  
 چندرا۔ اوجھ۔ کون جالے۔ ابھی کپڑے نہیں بدلے۔  
 سیوٹی۔ تو بدلتی کیوں نہیں سیکھیاں تمہاری مادہ دیکھ رہی ہیں۔  
 چندرا۔ ابھی میں نہ بدلوں گی۔  
 سیوٹی۔ یہ سنا اچھی نہیں لگتی بسبب اپنے دل میں کیا کہتی ہو گی؟  
 چندرا۔ تم نے تو چٹھی پڑھی تھی۔ آج ہی آنے کو لکھا تھا؟۔  
 سیوٹی۔ اچھا تو یہ ان کا انتظار ہوتا ہے۔ یہ کہیے جی یہ جوگ سادھا ہے  
 چندرا۔ دوپہر تو ہوئی شاید اب نہ آئیں گے۔  
 اتنے میں کملہ اور اُمادیٹی دونوں طراے بھری تپ پہنچیں چندرا نے گھٹکھٹ  
 نکال لیا۔ اُو فرزند پرما بیٹھی۔ کملہ اس کی بڑی نندہ ہوتی تھی۔  
 کملہ۔ ارے۔ ابھی تو انہوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔  
 سیوٹی۔ جھیا کی باٹ سمجھ رہی ہیں۔ اسی لئے یہ بھیس رچا ہے  
 کملہ۔ پاگل ہیں۔ انہیں غرض ہو گی آپ آئیں گے۔  
 سیوٹی۔ ان کی دنیا نالی ہے۔  
 کملہ۔ مردوں کی محبت چاہے کتنی ہی کرے مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے نہیں تو

وہ شیوہ جو آج ہے خواہ مخواہ مسئلے اور جملہ نے لگتے ہیں۔ مگر تم انکی کچھ پرہیز نہ کرو۔ اس سبب سے بات نہ کرو تو تمہاری ہر طرح خاطر کریں گے۔ علم بر حجاب واریں گے۔ مگر جوں ہی انہیں معلوم ہوا کہ لباس کے دل میں میری جگہ ہو گئی ہے جس اسی دل کے ان کی نگاہ پلٹ جائیگی۔ سیر کو جائینگے تو خواہ مخواہ دیر کر کے آئینگے۔ کھلانے بیٹھیں گے تو منہ جو بھا کر کئے کٹھ جائینگے۔ بات بات پر بدھیں گے۔ تم لوگ تو منا میں گے۔ او دل میں خوش ہوئے کہ کیسا شکر کھلائے۔ ہے تمہارا سامنے دوسری عمدتوں کی تعریف کر بیگے۔ غرض تمہیں جملہ نے دل نہیں مرانا لگے گا۔ اب میرے ہی گھر میں بیٹھو پہلے اتنی خاطر کرتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ ہر دم لیکر دل کی طرح ہاتھ باندھے حاضر پیکھا جھلنے موجود۔ ہاتھ سے لقمہ کھلانے کو موجود۔ یہاں تک کہ (مسکرا کر) کہہ دیتے بھی شانہ تھا۔ بات منہ سے نکلی نہیں اوروں ہی ہوئی۔ میں اس وقت اپنی تھی۔ حجاب کے اوّل پہنچا کیا جالوں میں آگئی۔ سیدتی جھوٹ نہ ماننا اسی دن سے انکی آنکھ بدل گئی۔ لگے بے بسپا کر لئے۔ ایک دوسرے کو دھک کر چلائے۔ ادھی رات کو گورا گلے میں ڈالے۔ عطر میں بھرے ہوئے گھرا گئے۔ بچہ سمجھتے تھے کہ آج ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگی۔ میں نے لمبی تانی تو رات بھر روٹ نہ بدلی۔ دوسرے دن بھی نہ بدلی۔ آخر اللہ جی آئے۔ پیروں پر گرے۔ گرا کر لائے۔ تب سے میں نے بات کرہ باندھ لی ہے کہ مردوں کے کبھی محبت نہ جتاؤ۔

سیدتی۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔ جیسا کہ شادی میں آئے تھے۔ بڑے نہیں کھ آدمی ہیں۔ کمال۔ یا ربتی ان دنوں پیٹ میں تھی۔ اسی سے میں آسکی تھی۔ یہاں سے تو لگے تمہاری نظر کرنے۔ تم کبھی پالتا ویہ گئی تھیں کہتے تھے کہ میں نے ہاتھ پیر کر بیٹھ لیا۔ او۔ خوب خوب باتیں مدلیں۔

سیدتی۔ (منہ مسکراتے ہوئے) میں زمانہ کے لمباڑے بات سے ہوئی کہ گلیا اور جی دونوں کسی

کام سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اتان لے کر کہا کہ کھل کے گئے ہیں۔ پان بنا کے دے۔ میں پان لیکر گئی۔ چار پانی پر لیٹے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے۔ میں نے پان دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو آپ نے کللی پکڑ لی اور کہنے لگے کہ ایک بات سن لو۔ ایک بات سن لو مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔

کمرہ نکلی نہ جھوٹی بات۔ وہی تو میں بھی کہہ کر گیا رہ بلکہ برس کی چھوڑی۔ اُس نے اُن سے کیا باتیں کی ہونگی مگر نہیں اپنی ہی ضد کے جانیں۔ مرد بڑے ڈینگے ہوتے ہیں۔ میں نے یہ کہا میں نے وہ کہا۔ میرا تو ان باتوں سے جی جھلکا ہے۔ نہیں معلوم انہیں اپنے ادھر جھوٹی تہمت لگانے میں کیا مرزا آتا ہے۔ آدمی جو کرا بھلا کرتا ہے اس پر پر ڈالتا ہے مگر یہ لوگ کرینگے تو عقوڑاؤ ڈینگے کہنے کو مردم تیار ہیں تو جیسے اُنکی ہلک بات بھی سچ نہیں ملتی۔ اتنے میں گلیا لے کر کہا۔ ”تم تو یہاں بھاڑی تہمت لگاتے ہو اور تمہارا سیکھی تمکا آنگن میں بلوتی ہیں۔“

سیلوٹی۔ دیکھو بھائی اب دیر نہ کرو۔ گلیا! ان کے صندوق سے کپڑے تو نکال لے۔ کمرہ چندرا کا سنگار کرنے لگی سیلوٹی ہسپتالوں کے پاس آئی رُکمی بولی۔ ”واہ ہاں خوب! وہاں جا کر بیٹھیں۔ تمہاری دیوا دول سے ہنسیں لولیں کیا؟“

سیلوٹی۔ ”مگر کلاہن چلی گئی اُن سے بات چیت ہونے لگی۔ دونوں آہی ہیں۔“

رُکمی۔ ”رُکمی ہیں نہ۔“

سیلوٹی۔ ”تین ہونے تھے۔ ایک بار سال ہو گیا۔ دو موجود ہیں۔“

رام دینی۔ ”مگر کاٹھی بہت اچھی ہے“

چندا کتور۔ ”مجھے اُن کا بانک بہت پسند آیا جی چاہتا ہے چھین لوں۔“

سیتا۔ باتک واقعی بہت اچھی ہے۔ دونوں بہن ایک سے ایک بڑھکر ہیں۔  
 رُکمنی۔ اگئی طبیعت۔ اُمادی نہیں تو تم جان دینے لگتیں۔  
 سیتا۔ دوسروں پر تو وہ جان دے جس کو دیکھا کر دو۔ یہاں تو لاکھ دو لاکھ میں ایک ہے  
 رُکمنی کے شوہر ذنا رنگ کے گھرے تھے اور نقشہ بھی سڈول نہ تھا۔  
 رُکمنی۔ صورت لیکر جانی نہیں جاتی۔

سیتا۔ وہ تو دل ہی جانتا ہوگا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ چاہے روکھی روئی کھلنے کو ملے۔  
 جھونپڑے میں رہنا پڑے مگر صورت دیکھتے ہی سب کچھ دُور ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ جھنگلی  
 صورت دیکھ کر بچا چڑھائے۔ جی متلا لئے لکھ۔

سیوٹی۔ سیتا کو ایشو نے برا چھادیا ہے۔ اُس نے سولے کی کو پوچی تھی۔  
 رُکمنی۔ (جلکر) گورے چمڑے سے کچھ نہیں ہوتا۔  
 سیتا۔ تمہیں کالا ہی پسند ہوگا۔

سیوٹی۔ مجھے کالا بڑا ملتا تو زہر کھا لیتی۔  
 رُکمنی۔ یوں کہنے کو جو چاہے کہہ لو مگر سچ پوچھو تو آرام کالے ہی دو لہا سے ملتا ہے۔

سیوٹی۔ آرام نہیں خاک ملتا ہے۔ کہن سا آکے لپٹ جاتا ہوگا۔  
 رُکمنی۔ یہی تو تمہاری ترکیب کی باتیں ہیں۔ تم جانتی نہیں خوبصورت مرد ہمیشہ اپنے ہی  
 بناؤ سنگار میں لگا رہتا ہے۔ اُسے اپنے آگے بیوی کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ اگر عورت بچہ  
 خوبصورت ہے تو خیر ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس سے بھاگنے لگتا ہے۔ وہ  
 سمجھتا ہے کہ میں ایسی دوسری عورتوں کے دل پر آسانی سے قابو پا سکتا ہوں۔ بیچارہ  
 کالا کر د آدمی خوبصورت بیوی پا جاتا ہے تو سمجھتا ہے مجھے میرے کی کھان مل گئی۔

صورت کی کسروہ پیادہ اور خاطر داری سے پُوری کرتا ہے۔ اُسکے دل کو بہت شریہ غدغہ لگا ہے کہ میں ذرا بھی اس سے نرس نہ ہوا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیگی میں اگر آدھی رات کو کہوں کہ گرم گرم مہلوہ کھلا دو تو ممکن نہیں بلکہ اسوقت حکم کی تعمیل نہ کریں۔ آج کسی گھنٹی فرمائیں کہ رُفتل تو گھر بچکر حاضر کریں۔

چند لمکھوہ دلفعا سے اچھا وہ جو منہ سے بات نکلتے ہی پوری کرے۔  
 رام دیٹی۔ تم اپنی بات نہ چلاؤ بہتیں تو اچھے اچھے کہنوں سے سروکلا ہے۔ دولا کدیب ہی ہو۔  
 سیتا۔ نہیں معلوم کئی اپنے مرد سے کسی چیز کی فرمائیں کیونکر کرتا ہے کیا لحاظ نہیں معلوم ہوتا۔  
 رُکمنی۔ تم بیچاری کیا ذرائع کر گئی۔ کئی بات تو بچھے  
 سیتا۔ میرا تو نہیں دیکھ ہی کہے جی بھرا نا ہے گھنے کپڑے کی طروت طبعیت بہتیں ہوتی۔  
 سیدوٹی۔ سیتا کا خوب جوڑ ہے۔

رام دیٹی۔ جوڑ جو سچ پوچھو تو چند اکھوہ اور کلونت رائے کا خوب ہے۔  
 سیدوٹی۔ یہ انہیں نہ پاتی ہوئی تو بیچارے کھ گھیلنے لگتے ہونگے۔  
 چند اکھوہ بھاری بھر کم گدا جسم کی نازنین بھی کلونت رائے مخنی اور ضعیف اقامت تھے۔  
 رام دیٹی۔ اپنی قیمت کو کوستے ہو گئے کہ ایسی دیوٹی کہاں سے پاتی۔  
 چند اکھوہ۔ جب دیکھو بد بھمی کی شرکایت۔ دو چپا تیاں کھائیں جب بھی بد بھمی  
 ذرا سا دودھ پیئیں جب بھی بد بھمی۔ تاک میں دم ہے۔  
 سیدوٹی۔ بیچارے تم سے ڈرتے ہو گئے۔

سیتا۔ اُن کے سامنے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چاہیں تو انہیں گود میں کھلائیں۔  
 رُکمنی۔ ہلکے پس سارے زمانے میں ایک تم اچھی اور ایک تمہارا دولا۔ باقی سب جوڑ۔ اُن



سیتا۔ تمہیں کاجے کو کڑوا لگتا ہے۔

اتنے میں ایک اور ازین ہلوہ افرنہ ہوئی کہنے سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی۔  
پرتکلف جو بلا پہنے عطر میں بسی، مڑ مڑی سے لیس اس کے ہونٹوں سے سونجی و شرارت برسی ہی تھی۔  
رام دٹی۔ آہ رانی آؤ تمہاری ہی کسر تھی۔

رانی۔ کیا کروں نگوڑی تارن سے کسی طرح پیچھا ہی نہ چھوڑتا تھا، کلشیم کی ماں آئی، تب  
جا کے چوڑا بندھا۔

سیتا۔ تمہاری جاکٹ پر بچھاؤ ہوئے کی جی چاہتا ہے۔

رانی۔ اس کا قصہ کچھ نہ پوچھو۔ کپڑا دے دینے میں نہ بھر ہوا۔ دس بارہ مرتبہ درزی سی کر لایا۔  
مگر کبھی آستینیں ڈھیلی کر دی، کبھی بخیر بگاڑ دیا۔ کبھی چنت خراب کر دی۔ بالے سبھی  
چلتے چلتے دیگیا ہے۔

سیوٹی۔ البیلے بالہ میں یہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں؟

رانی۔ میری بلا جاتے۔ جیسے کشتہ گھر رہے ویسے رہے ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ مادھوی نل مچاتی ہوئی آئی۔ بھیا آئے۔ ان کے  
ساتھ جیجا بھی ہیں۔ اوہ ہو ہو۔

رانی۔ کیا زادھا چرن آئے ہیں کیا؟

سیوٹی۔ ہاں چلو ذرا اچھائی کو سن لیا دے آؤں کیوں لے کہاں بیٹھے ہیں۔

مادھوی۔ اسی بڑے کمرے میں جیجا بیگڑی باندھے ہیں۔ بھیا کوٹ پہنے ہیں۔ مجھے  
بھیٹلے ہو یہ دیا۔ یہ کہہ کر اس نے منھ کی کھول کر دکھائی۔

رانی۔ تو اب ہنس بیٹھا کراؤ۔

سیوٹی کیا میں نے کوئی ہمت مانی تھی؟  
 سیتا۔ باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔ آنکھوں میں نشہ آ گیا ہے۔  
 رانی۔ یہ سادگی تم پر خوب چھپتی ہے۔ خاصی پری معلوم ہوتی ہو۔  
 سیوٹی۔ (چندرا کے کمرے میں آکر بیٹی)۔ بوجھائی تمہارا شکون ٹھیک اُترا۔  
 چندرا۔ کیا آگئے۔ ذرا جا کے اندہ بلاؤ۔

سیوٹی۔ ہاں مردانے میں چلی ہاؤں تمہارے بہنوئی صاحب بھی تو پیدھا لے ہیں۔  
 چندرا۔ باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں کسی کو بھیج کر بلا لیتیں۔ نہیں تو دوسروں سے  
 باتیں کرنے لگیں گے۔

ایک کھڑاؤں کی آواز آئی۔ اُدرا دھاچرن آتے دکھائی دیئے۔ سن  
 چوبیس چھپس سال سے زائد نہ تھا۔ بہت ہی خوشرو۔ سرخ و سفید۔ انگریزی تراش  
 کے بال۔ فریخ تراش کی ڈاڑھی کھڑی مٹھیں۔ لیونڈر لپٹیں آ رہی تھیں۔ بدن پر  
 صرف ایک ریشتی مہین کرتا تھا۔ آکر چارپائی پر بیٹھ گئے اور سیوٹی سے بولے۔ ”کیسے  
 ستو ہفتہ بھر سے خط نہیں بھیجا۔“

سیوٹی۔ میں نے سوچا اب تو آ رہے ہو۔ کیا خط بھیجوں۔  
 یہ کہہ کر سیوٹی وہاں سے کھسک گئی۔ چندرا نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔  
 وہاں جا کر بیٹھ جلتے ہو۔

رادھاچرن۔ (گلے سے لگا کر) جب ہی سیدے کڑواں کو س سے دوڑا چلا آتا ہوں۔

## بارات کی رخصتی

بارات دھوم دھام سے گئی اور تین دن بعد ہی شنب روز عیش و مسرت کے جلسہ ہوتے رہے۔ پہلے دن آدھی رات کے وقت منہ کے نیچے شادی کے مراسم ادا کئے گئے تھے۔ باراتی فرس پر بیٹھے۔ برجن ایک شگرفی رنگ کی ساڑی پہنے۔ لمبا سا گھونگھٹ نکالے آئی اور کمر چرن کے بغل میں بٹھائی گئی۔ ہون ہوا۔ سنسکرت کے شلوک پڑھے گئے۔ جو دولہا دلہن کے سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ عمدہ تول نے شہانگ کے گیت گائے۔ پھر دولہا دوہن نے ہون کند کاسات بارطاف کیا۔ اس کے بعد دولہا کہیں میں گیا جہاں عورتوں نے اسے برجن کا جو ٹھاپان کھلایا تاکہ وہ ہمیشہ بیوی کا غلام بند رہے۔ اس سے غول پھنے کی فرمائش کی جس کی تعمیل وہ نہ کر سکا۔ پھر اس کی وضع قطع اور حسب نسب کی ہنسی اڑائی۔ اس کی مال اور باپ کو اور بہنوں کو خد معلوم کیسی خوش گالیاں دیں جو دولہا کو ذرا بھی ناگوار نہ معلوم ہوئیں بلکہ وہ خوش ہو کر سنتا رہا۔ دوسرے دن دس بجے کلیو کا رسم ہوا۔ نوشہرہ خاص خاص رشتہ دار کے آنگن میں بیٹھا۔ باسی پوئیاں اس کے سامنے ایک طشت میں لاد آگئیں۔ فیشی سے اس نے پانچ اشرفیاں تھالی کے پاس رکھ دیں اور چمکا کر کہا بیٹا کھاؤ مگر نوشہرہ نے ہاتھ دیا۔ آیا۔ تہا ایک سونے کی انگوٹھی ایک دشتالہ جس پر زریں کام بنا ہوا تھا۔ ایک چاندی کا گلاس جو چاندی سے نکلی ہوئی تھی۔ لاکر رکھے گئے۔ اس پر بھی نوشہرہ نے پوریوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ تین دن کے بعد رات دھوپ چرن کی طرف

دیکھ کر کہا۔ بالو صاحب۔ اب آپ کھالے کی اجازت دیجئے۔ بالو صاحب نے ہنس کر کہا۔ میں نے منع تھوڑا ہی کیا ہے۔ کھالتے کیوں نہیں۔ کھلو کھالو کھلو نے بھائی کی طرف دیکھا مگر بچلے اجازت کے مانع پانی، سمیون لال گھر میں گئے۔ ایک مومن مالہ اور دو انگوٹھی اور لائے اور پھر نوشہ سے حاضر تناول فرمانے کی التجا کی۔ رادھا چرن نے کھلا سے کہا۔ خاموش کیوں بیٹھے جو کچھ عرض کرنا ہوا صاف صاف دلیان صاحب کرو۔ کھلا کے بہنوئی پران ناتھ نے کہا نوشہ کی طرف سے میں ایک گھوڑے کی درخواست کرتا ہوں بدلتی جی پھر گھر میں گئے۔ سببا سے کہا یہ لوگ پورے ڈاکو ہیں۔ دو دھائی سو ڈکار گئے۔ اب سواری کے لئے گھوڑا مانگتے ہیں۔ سببا نے جواب دیا گھوڑا مانگتے ہیں گھوڑا دیجئے۔ اُنکی خواہش تو پوری ہو۔ بدلتی جی نے مجبور ہو کر اپنے ٹم کا گھوڑا دیا۔ تب کھلا بہنوئی نے نوالہ اٹھایا اور گن کر پانچ بار لکھ منہ تک لیگئے۔ شام کے وقت راتوں کی فیتا ہوئی۔ تکلف سے کھانا رکھا گیا۔ لوگ کھالے بیٹھے۔ ڈونیاں اندر گانے لگیں۔ آپ اللہ نیو آئے میں آئے۔ میا کسے دے آئے اے ہنا کسے دے آئے پھو بھی تمہاری مدد کی ماتی۔ اُسکو نہ کیوں لے آئے۔ کسے سو نہ آئے۔ منشی پیارے لال نے فرمایا پران ناتھ گالیں کے اندر دشتان ہیں۔ ڈونیاں نے دوسرے گیت میں اُن کی خبر لی۔

پران ناتھ بالو تم ہوا بھی نادان  
 ہیں تمہاری بہت سیانی گھر گھر ہوت بکھان۔ تم ہوا بھی نادان  
 سچ پر اُس کے اُس دن آتے۔ دس دس مہینے اُنجان۔ تم ہوا بھی نادان۔  
 دُپٹی شیا ماچن نے فرمایا پیالے لال کو کیوں چھوڑی ہو۔ ان کی بہن

کا نام چھپا ہے۔ ڈومنین نے گایا۔

چمپا تیری کلیاں بہت سہانی۔ رنگ تیرا مجھے بھلایا۔ رنگ تیرا مجھے بھلایا  
تیری صورت پر چیت سے نہ اترے۔ تو نے مجھے اپنلایا۔ رنگ تیرا مجھے بھلایا۔  
اسی طرح فولیٹین کر کر کے لوگ گالیاں سنائے۔ کوئی بمالی نہ بچا۔ یہاں تک کہ  
گاتے گاتے ڈومنین کا جی اٹا گیا۔ مگر سنے والوں کو سیری نہ ہوئی۔ ہنسی پیلے لال لال  
پھر تانہ فرباش کی ڈومنین نے محض گالیاں دینی شروع کیں۔ آخر اٹھ بچے بچے کھانا  
ختم ہوا۔ تیسرے دن نصی کا وقت تھا۔ علی الصبح بارانی اصحاب مندر کے نیچے  
جمع ہوئے۔ ہنسی سمجھیں لال اور ان کے رشتہ دار بارہاں سے بخلگیر ہوئے۔ تو  
بچتے بچتے بارہاں رخصت ہو گئی۔ آئی تھی کس شان سے گئی بالکل اس طرح جیسے  
کوئی شکست خوردہ فوج۔ گامینوں نے رخصت لانے کے گیت گائے۔ ہنسی شیلہ  
نے گلی گلی کے لئے ایک اشرفی العامدی کمرہ چرن اندر گئے۔ اس نے چھانی  
سے لگایا چلتے وقت پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ شادی بڑی خوبی سے انجام کو پہنچی  
شہر میں چاروں طرف واہ واہ کی دھوم مچ گئی۔

## حسد

پرتاپ چند نے برون کے گھر آنا چاہنا شادی کے کچھ دن پہلے ہی سے ترک کر دیا تھا۔ شادی کے کسی کام میں نہ شرکت کیا۔ حتیٰ کہ محفل میں نہ گیا۔ مغموم ہوتے بنائے منہ لٹکائے اپنے گھر میں بیٹھا رہا۔ منشی بھیرن لال۔ سو سبلا۔ سبلا سبلا۔ خوشامیوں کو کہہ ہار گئے۔ بگڑاؤں نے بارات کی درختوں تک نہ کیا۔ آخر میں منشی جی بیدہ خاطر ہو گئے۔ اور پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ یہ کیفیت شادی کے ہونے تک تھی۔ شادی کے بعد سے تو اس نے ادھر کا راستہ ہی ترک کر دیا۔ سلسلہ جاتا تو اس طرح کتر کر نکل بھاگتا گیا سامنے کوئی شیر بٹھتا ہوا ہے یا جیسے تھا منہ کر نیوالے ہاں جوں کے سامنے سے مقبوض آدمی نظریں بچا کر نکل جاتا ہے۔ برون کی تو پرچھائیں سے بھگتا۔ اگر کبھی اُسے اپنے گھر میں دیکھ پاتا۔ تو اندر قدم نہ رکھتا۔ مٹی سمجھاتی۔ بیٹا تم برون سے بولتے چلے کیوں نہیں سیکوں اس سے منہ موڑ لےتے ہوئے ہو۔ وہ آکر گھنٹوں روتی ہے کہ میں نے کیا کیا کہ جس سے یہ ناراض ہو گئے۔ دیکھو تم اور وہ کتنے وصال تک ایک ساتھ رہے۔ تم اُسے کتنا پیار کرتے تھے بیکایک تم کو کیا ہو گیا۔ اگر تم اسی طرح روٹے رہے تو غریب لڑکی کی جان پرین جائیگی سو کہہ کر کاٹا ہو گئی ہے۔ اللہ جانتا ہے مجھے اُسے دیکھ کر ترس آتا ہے۔ سو لے کر تھا اب ذکر کے اُسے جیسے کوئی دوسری بات ہی نہیں معلوم۔ پرتاپ آنکھیں نیچی کتر ہوئے

یہ سب سُنتا اور چپ چاپ سرک جاتا۔  
 پرتاپ اب کسمن بچہ نہ تھا۔ اُسکی زندگی کے پورے میں شباب کی لہریں  
 پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے بہت دُلیں سے۔ اُس وقت سے جبکہ اُس نے ہنسنے سنبھالا  
 اپنے طفلانہ خیالوں میں برجن کی زندگی کو اپنی زندگی سے شیر و شکر کی طرح ملا لیا تھا  
 اُن دل فریب اور سہلے خیالوں کا اس بیلادی اور سیرجی سے خاک میں ملا یا جانا  
 اس کے نازک دل کو پابہ پابہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں برجن کا  
 سب کچھ تھا کہیں کا نہ رہا۔ اور وہ جس نے برجن کو ایک لمحہ کے لئے بھی خیال میں  
 جگہ نہ دی سب کچھ ہو گیا۔ اس خیال سے اس کے دل میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی۔  
 اور جی چاہتا کہ جن لوگوں نے میراظم خواب یوں توڑا ہے۔ اور میری زندگی کی  
 آند میں یوں مٹی میں ملٹی ہیں انہیں میں بھی جلاؤں اور سُلگاؤں۔ بسکے نیاہ  
 غصہ اُسے جس پر آتا وہ غریب سو سیلا تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ جب  
 مدرسے سے آتا تو کلاس چرن کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت منور بیان کرتا۔ خصوصاً  
 اس وقت جبکہ سو سیلا بیٹھی ہوتی۔ اس غریب کا دل دکھلنے میں اُسے خاص مزہ آتا  
 اگرچہ جھوٹ بولنے کی اسے عادت نہ تھی۔ جو کچھ وہ کہتا وہ حقیقت ہوتی تھی۔ مگر  
 دائمی طور پر اُس کا طرز بیان اور انداز تقریر کچھ ایسا دلخراش ہو جاتا کہ سو سیلا  
 کے جبکہ تیری طرح چُھچھاتا۔ آج میاں کلاس چرن تپائی کے اوپر کھڑے تھے۔ سر  
 آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ مگر بیچیا اتنے بڑے کہ جب میں نے اُن کی طرف اشارہ  
 کیا تو کھڑے کھڑے ہنسنے لگے۔ آج بڑا مزہ آیا۔ کلاس نے ایک لڑکے کی گھر کی آڑی  
 اس نے ماسٹر صاحب شکایت کی۔ اُس کے قریب ہی یہی حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔

ماسٹر نے تلاشی لی تو آپ کے آگے آگے میں گھری ملی۔ پھر کیا تھا باڑے ماسٹر کے یہاں تلاش ہوئی وہ سنستے ہی کھلا گئے اور کوئی تین دہائی چنچیاں رسید کیں مٹر مٹر مٹر مٹر! تمام اسکیل تماشہ دیکھتا تھا۔ جب تک چنچیاں پڑائیں حضرت داد فریاد پھیل گئے مگر باہر نکلتے ہی کھل کھلنے لگے۔ اور مڑھوں پر تڑا دیا۔ چچی نہیں مٹا آج لوگوں نے عین ملہ سے کے دھارے پر کھلا چرن کو پیٹا۔ مار لے مار لے بیدم کر دیا۔ ملی ہوا۔ آگے اس اسی قسم کی وارداتیں بیان کر لے کہ طوائف سوسیلہ صنعتی اور سن سن کر رہتی تھیں۔ ہاں پرتاپ اس قسم کی کوئی بہت برج کے سامنے نہ کرتا۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی بھی ہوتی تو جب تک چلی نہ جائے یہ تذکرہ نہ پھیڑتا۔ اسے منظور نہ تھا۔ کہ میری کسی بات سے اسے مدد نہ پہنچے۔

پرتاپ کی کہ رداہیل کی تائید اتفاقیہ طور پر ہنسی سمجھیں لال نے بھی باہمی کی۔ کبھی کھلا بانہ میں طیل لے لے جاتا۔ کبھی شہر کے ساتھ سگٹ پیٹے۔ پان جاتے بدھنی سے گھومتا ہوا نظر آ جاتا۔ ہنسی جی جب داماد کی یکہمنیت دیکھتے تو گھبراتے ہی بیوی پر غصہ اُتارتے۔ یہ سب تمہارا ہی کردار ہے۔ بہتیں رکھی ہوئی تھیں کہ گھر بردوں اسچھے ہیں۔ ماہدیاں سوقت یہ خیال نہ رہتا کہ جتن الزام سید سیلا رہے کہ ماہدیاں کہ اتنا ہی مجھ پر بھی ہے۔ وہ بیجاری تو چار دیواری میں بند تھی۔ اسے کیا خبر کہ لڑکھن قماش لکھے۔ شاد رنگ قدیا محو ڈیڑی بڑھی تھی۔ اس کے ماں باپ کی شریف دکھا اس پر عالی خاندان خوی رہتے۔ راضی ہو گئی۔ مگر ہنسی جی نے تو محض کاہلی پورسل بنگاری کی وجہ سے چھان بنان نہیں کی۔ حالانکہ انہیں اس کے بہت سے موقع حاصل تھے اور ہنسی جی کے بیٹا بھائی اسد بھی ہندوستان میں موجود ہیں جو اپنی پیاری لڑکیوں



کیا اسی طرح آنکھ بند کر کے کنوئیں میں ڈھکیل دیا کرتے ہیں۔

سوسیلہ کو دنیا میں برجن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہ تھی۔ برجن اُسکی جان بھتی۔ اُس کا دیر بھتی۔ اُس کا ایمان بھتی۔ اُس میں اُس کی جان بستی بھتی۔ وہ اُسکی آنکھوں کا نڈا اور اُس کے دل کا سرور بھتی۔ اُس کا سب سے بڑا دنیاوی ارمان یہ تھا کہ میری پیاری برجن اچھے گھر چلے۔ اُس کے سانس سرور دیوی دیوتا ہوں۔ اُس کا شہر بہتر اُلفت کا پتلا اور سری راچندہ جی کی طرح سوشیل ہو۔ اس پر کسی آواز کی پر پھائیں بھی نہ آنے پائے۔ اُس نے مر مر کر ٹہری منتوں سے یہ لڑکی پانی تھی اڈ اُس کی آواز نہ تھی کہ اس سیمی اُنکھوں کی اپنی بھولی بھالی لڑکی کو مرتے دم تک اُنکھ سے اوجھل نہ ہونے دے گی۔ اپنے داماد کو بلا دے گی۔ اپنے گھر بکھولے گی۔ برجن کے بچے بھونکے اُنکی برادرش کو دے گی۔ داماد مجھے اماں کہیگا۔ میں اُسے لڑکا سمجھ گئی جس میں یہ ارمان ہوں اُس پر ایسی ایسی ہل آواز اور دلخاش باتوں کا جو کچھا شہ ہو گا ظاہر ہے۔

افندہ راغریب سوسیلہ کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ ماسکی سلسلہ اُردو را اُس پر لگی۔ کیا سوچتی تھی اور کیا ہو گیا۔ اپنے دل کو ہار یا سمجھاتی۔ کہ ابھی کیا ہے۔ سمجھ آجائیں تو یہ سب باتیں آپ ہی چھوڑ دیگا۔ مگر ایک شکایت کا زخم بھرنے نہ پاتا کہ چہ کوئی تانہ واردات سُنے میں آجاتی۔ اسی طرح زخم پر زخم پڑتے گئے۔ جانے نہیں معلوم برجن کے بھاگ میں کیا بدا ہے۔ کیا یہ حسن و شہد کی پتلی۔ میرے گھر کا اُجلا۔ میرے جسم کی جان اسی بدقماش آواز شخص کے ساتھ زندگی کاٹیگی۔ کیا میری شایا اسی گودھ کے پاؤں پر لگی! یہ سوچ کر سوسیلہ رونے لگتی۔ اور گھٹنوں روتی۔ پہلے برجن کو کبھی کبھی دانٹ ڈپٹ بھی دیا کرتی تھی۔ اب بھول کر کوئی بات نہ کہتی۔ اُسکی صورت دیکھتے ہی اُسے رحم آجاتا

ایک لمحہ کے لئے بھی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ اگر ذرا دیر کے لئے وہ سُبّا لے کر چل جاتی۔ تو اُس کے پیچھے لگی خود بھی جا پہنچتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی اُسے پھینے لئے جاتا ہے جس طرح اپنے بچے کو قصائی کے بغدے کے نیچے دیکھ کر گائے کا سویلا رویا کلنپے لگتا ہے۔ اُسی طرح برجن کی مصیبت کا خیال کر کے سویلا کی آنکھوں میں دُنیا تارک ہو جاتی تھی۔ ان دنوں برجن کو دم بھر کے لئے نگاہوں سے دور کرتے اُسے دُقلق اور گھبراہٹ ہوتی تھی جو چڑیا کو گھونسلے سے بچل کے کھوجانے پر ہوتی ہے۔

سویلا ایک توئیل ہی دائم المریض تھی۔ اُس پر آئے دن کی کوفت اور جلنے لے اُسے اور بھی گھلا ڈالا۔ بدلی کی فکر سوہان روح ہو گئی۔ شکایتوں نے کلیجہ پھلنی کر دیا۔ چچ مہینہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ تپ تپ کے آثار نمودار ہو گئے۔ پہلے تو ہفتہ عشر تک طبیعت پر زرد لکڑا لکڑا بنا آنا ردل چھپاتی رہی۔ مگر آخر تک بے مرض بڑھنے لگا۔ طاقت نے جو ابے پیدا۔ قیدی بستر ہو گئی۔ حکیم اور فاکٹر علاج کرنے لگے۔ تین چار مہینے میں حالت ایسی نازک ہو گئی کہ معالجوں نے بھی علاج سے ہاتھ اٹھا لیا۔ برجن اوسبانا دونوں شب روز اُسکے پاس بیٹھی رہتیں۔ برجن ایک لمحہ کے لئے بھی اُسکی نظروں سے اکھیل نہ ہونے پاتی۔ اُسے اپنے پاس نہ دیکھ کر سویلا بدھاس سی ہو جاتی۔ اندر چرچہ چرچہ کر رونے لگتی۔ منشی سمیون نل پہلے تو سر گرمی سے علاج کرتا رہا۔ مگر جب دیکھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا اور مرض کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے تو آخر انہوں نے بھی یلوس ہو کر ہمت چھوڑ دی۔ آج سے کئی سال پہلے جب سُبّا بیمار پڑی تھی۔ اُس وقت سویلا نے اُس کی تیمارداری میں بڑی جالفتشانی کی تھی۔ اب سُبّا کی باری آئی۔ ۱۰۔ اُس نے ہمسائیگی اور ہنسپے کا حق تو پوری طرح ادا کر دیا۔

تیمارداری میں اپنے گھر کا کام کاج بھول گئی۔ دو دو تین تین دن تک پرتاپ سے بولنے کی نوبت نہ آئی۔ اکثر وہ بے کھانا کھائے ہی مدر سے چلا جاتا تھا۔ مگر کبھی حنف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ سو سیل کی حالت نے اب اُسکی آتشِ حسد کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ حسد کی آگ محسوس کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے اور اُسی وقت بجھتی ہے جب محسوس کی زندگی کا چرلغ بجھ جاتا ہے۔

جس دن برج رانی کو معلوم ہو جاتا کہ آج پرتاپ بلا کھانا کھائے مدر سے جا رہا ہے اُس دن وہ سب کام چھوڑ کر اس کے گھر دوڑی جاتی اور کھانے کے لئے بندہ کرتی۔ مگر پرتاپ اس سے بات تک نہ کرتا۔ اُسے روئے چھوڑ کر باہر چلا جاتا۔ اس میں تنک نہیں کہ وہ برجن کو بالکل بے خطا سمجھتا تھا۔ مگر ایک ایسے رشتے کو جو برس بھر مہینے میں منقطع ہونے والا ہو وہ پہلے ہی سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ تہائی میں بیٹھ کر وہ آپ ہی آپ گھنٹوں پھوٹ پھوٹ رہتا۔ مگر ضبط کا مادہ اس کے دل میں کچھا لسیا مضبوط تھا کہ وہ اپنے جوشِ محبت کو قابو سے باہر نہ ہونے دیتا۔

ایک روز وہ مدر سے سے آکر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ برجن آئی۔ اُس کے رخسار آئینے سے تر تھے اور لمبی لمبی سسکیاں لے رہی تھیں۔ اُس کے چہرہ پر اس وقت کچھ ایسی حسرت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی اور نگاہیں کچھ ایسی التجا آمیز تھیں کہ پرتاپ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آبدیہ ہو کر لولا۔ ”کیوں برجن؟ روکیلا رہی ہو؟“

برجن نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ اور ہلکے ہلکے روئے لگی۔ پرتاپ کا ضبط رخصت ہو گیا۔ وہ بیاب ہو کر اٹھا اور برجن کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔ برجن نے آواز نہ سنبھا لکر کہا۔ ”لو اب اماں نہ جیئ گی۔ میں کیا کروں؟“ یہ

کہتے کہتے وہ پھر بسکیاں بھر لے لگی۔

پرتاپ یہ خبر سُکر سناٹے میں آ گیا۔ بدحواس دوڑا ہوا بہن کے گھر گیا اور سو سیلا کی چارپائی کے پاس کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ہمارا آخری وقت کیسا لمبا رکھ ہوتا ہے۔ وہ ہمارے پاس ایسے ایسے بے رنجوں کو کھینچ لاتا ہے جو چند دن پہلے ہماری صُورت سے بیزار تھے۔ اور جنہیں سوا گھنٹہ طاقت کے دنیا کی کوئی دُور سڑی طاقت زیر نہ کر سکتی تھی۔ ہاں یہ دقت ایسا ہی طاقتور ہے۔ وہ بڑھاپے بڑے سرکش دشمنوں کو ہمارا امیر کر دیتا ہے جن پر ہم کبھی فتح نہ پا سکتے تھے۔ ان پر یہ دقت ہلکے فحتمند بنا دیتا ہے جن پر ہم کسی مقصد سے غالب نہ آ سکتے تھے ان پر یہ وقت باوجود قوی کے مضمحل ہو جانے کے ہلکے غالب کر دیتا ہے۔

آج پورے سال گھر کے بعد پرتاپ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ سو سیلا کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر چہرہ ایسا تنگ گھٹتا تھا جیسے صبح کے وقت کا کنول آج صبح ہی سے وہ رط لگائے ہوئے تھے کہ اللہ کو دکھا دو۔ سبامانے اسی لئے بہن کو بھیجا تھا۔

سبامانے کہا۔ بہن آنکھیں کھولو۔ اللہ کھڑا ہے۔

سو سیلا نے آنکھیں کھولیں اور اپنے دونوں ہاتھوں پر محبت سے پھیلا دئے۔ پرتاپ کے دل سے کینہ کا آخری نشان بھی محو ہو گیا۔ اگر ایسے وقت میں بھی کوئی انسان دلیں کینہ کا غبار دہنے دے تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے پرتاپ بچے فرنا لذتِ جوش سے آگے بڑھا اور سو سیلا کے آنکھیں محبت میں جا لیٹا۔ اور دونوں آدھ گھنٹہ تک روتے رہے۔ سو سیلا اسے دونوں ہاتھوں سے

ایسا دبا لئے ہوئے تھی گویا نہ کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اس وقت اپنے تئیں صد ہا  
 ملائمیں کر رہا تھا۔ میں ہی اس دکھیا کا جان لیوا ہوں۔ میں نے ہی حسد کے کینہ  
 جذبہ سے مغلوب ہو کر اسے اس نوبت کو پہنچا لیا ہے۔ میں ہی اس پریم کی مودت کا قاتل  
 ہوں۔ جو کہ مجھ میں یہ خیالات اُس کے دلیں آتے اُسی آنکھوں سے سنسہ بہتے تھے  
 آخر سوسیلہ بولی۔ ”لہذا میں دو ایک دن کی اندھن ہوں میرا جو کچھ کہا سنا ہو وہ مٹا  
 کر دو۔“ پرتاپ کی آواز قابو میں نہ تھی۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔

سوسیلہ پھر بولی۔ ”نہ جانے کیوں تم مجھ سے ناراض ہو۔ تم ہمارے گھر نہیں  
 آتے۔ ہم سے باتیں نہیں کرتے۔ جی بہتیں پیار کر لے کو ترس ترس کے رہ جاتا ہے  
 مگر تم میری ذرا بھی خبر نہیں لیتے۔ بتاؤ اپنی عزیز چچی سے کیوں روٹھے ہو۔ ایشو  
 جانتا ہے میں بہتیں ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھتی رہی ہوں۔ دیکھ کر میری چھاتی پھول اٹھتی  
 تھی.....“

یہ کہتے کہتے نقاہت کے باعث اُسکی آواز بہت دھیمی ہو گئی۔ جیسے اُن کی  
 اچھاہ وسعت میں اڑنے والی مرغابی کی آواز ہر لمحہ مدھم مدھم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک  
 کہ اُس کی آواز کا صوت خیال باقی رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح سوسیلہ کی آواز دھیمی  
 ہوتے ہوتے صرف سائیں سائیں رہ گئی۔

## سوسیلہ کی وفات

تین دن اور گزرے۔ سوسیلہ کے چلنے کی اب کوئی اُس باقی نہ رہی۔ تینوں دن نشی سچوں لال اُس کے پاس بیٹھے اُس کی نشی کہتے رہے۔ وہ ذرا دیر کے لئے بھی کسی کام سے چلے جاتے تو وہ بیکار ہوئے لگتی اور سو رو کر کہتی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ اُنکو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اُسے تسکین نہ ہوتی۔ رہ رہ کر ایک مجنونا جوش سے انکا ہاتھ پکڑ لیتی اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی مجھے چھوڑ کر کہیں چلے تو نہ جاؤ گے نشی جی کہ استقلال کے آدمی تھے مگر ایسی باتیں سن کر امید ہو جاتے۔ ذرا ذرا میں سوسیلہ پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پھر جتنی تو ادھر ادھر وحشت آمیز نگاہیں ڈالکر پوچھنے لگتی۔ وہ کہاں گئے؟ کیا چھوڑ کر چلے گئے؟ بعض اوقات لسان کا اتنا غلبہ ہو جاتا کہ نشی جی بار بار کہتے کہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ مگر اُسے یقین نہ آتا۔ اُنہیں کی طرف مکتی اور پوچھتی کہاں ہیں؟ یہاں تو نہیں ہیں۔ کہاں چلے گئے؟ ذرا دیر میں جب ہوش آجاتا تو خاموش ہو جاتی اور روئے لگتی۔ تینوں دن اُس نے بوجھ نہ سہا۔ پرتاپ۔ ان تینوں میں سے ایک بھی یاد نہ کی۔ سب کے سب ہر دم اُس کے پاس کھڑے رہتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بھرپور نشی جی کے اندر کسی کو پہچانتی ہی نہیں۔ جب بوجھ بہت بیکار ہو جاتی تو اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالکر روئے لگتی تو وہ ذرا آنکھیں کھول دیتی اور پوچھتی کون ہے؟ بوجھ؟

ہوں بس اور کچھ نہ پوچھتی۔ جیسے بخیل کے دل میں سرانے کے وقت سوائے اپنے ذلیفہ کے اور کسی بات کا دھیان نہیں رہتا۔ اُسی طرح ہندو عورت اپنے آخری لمحوں میں سوائے اپنے بچے کے اور کسی کا دھیان نہیں کر سکتی۔ کیونکہ بخیل کو اپنی دولت سے جتنی محبت ہے اُس سے بہت زیادہ بدرجہا محبت پتی برتا عورت کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔

کبھی کبھی سو سیلا ایک چونک پڑتی اور ہک ہک کر پوچھتی، ارے یہ کون کھڑا ہے۔ یہ کون بھاگا جا رہا ہے، انہیں کیوں لئے جاتا ہے۔ نہ میں نہ جانے دو گئی یہ کہہ کر منشی جی کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیتی۔ ایک لمحہ میں جب ذرا بخود دُور ہوتی تب شرا کر کہتی میں سپنا دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی تمہیں لئے جاتا تھا۔ دیکھو تمہیں ہماری قسم جانا نہیں۔ نہیں معلوم کہاں لیجا لیگا، پھر تمہیں کیسے دیکھو گی۔ اس منشی جی کا کلیجہ مسو سے لگتا۔ اُسکی طرف نہایت محبت آمیز شفقت اور درد سے بھری ہوئی نگاہ ڈال کر بولتے۔ نہیں میں نہ بھاؤں گا۔ تمہیں چھو کر کہاں جاؤں گا۔ سبانا اُس کی حالت دیکھتی اور روتی کہہ اپ یہ کچھ دیر کی اور دھماں ہیں ضرورت نہ لے اُسکی شرم و حیا سب دھو کر دی تھی۔ منشی جی کے سامنے گھٹنوں پر بے حجاب کھڑی رہتی۔

چوتھے دن سو سیلا کی حالت سن کر منشی جی کو یقین ہو گیا کہ بس یہ آخری فیصلہ ہے۔ چراغ گل ہونے سے پہلے صبح اٹھتا ہے۔ سویرے ہی جب باٹھ مہنہ دھو کر گھر میں آئے تو سو سیلا نے انہیں اشارے سے اپنے قریب بلایا اور بولی کہ مجھے اپنے ہاتھ سے تھوڑا سا پانی پلا دو۔ آج اُس پر تسیان کا غلبہ بہت

کلم معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے برجن، سُبلا، پرتاپ سب کو بخوبی پہچانا اور برجن کو بڑی دیر تک چھانی سے لگائے ردی تہی جب پانی پی چکی تو سبلا سے کہا۔ بہن ذرا ہنکوا اٹھا کر بیٹھا دو۔ سوامی جی کے پیر چھو لوں۔ پھر نہ جانے کب ان حیرنوں کے دل میں ہونگے۔ سُبلا نے روتے ہوئے اُسے ہاتھوں کے سہارے ذرا سا اٹھا دیا۔ پرتاپ اور برجن سامنے کھڑے تھے۔ سو سبلا نے منشی جی سے کہا ذرا نزدیک آ جاؤ۔ منشی جی اس وقت فرط محبت و درد سے بیخود ہو کر اُس کے سینہ سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے کہنے لگے تم گھبراؤ نہیں۔ ایسٹور چاہیے گا تو تم اچھی ہو جاؤ گی۔ سو سبلا نے ایسا انداز سے مسکرا کر کہا ہاں آج ابھی ہو جاؤ گی۔ ذرا اپنا پیر بڑھا دو۔ میں چوم لوں۔ منشی جی ہچکچاتے رہے۔ اُس وقت سُبلا پہلی بار دوتے ہوئے بولی۔ پیر بڑھا دیجیے۔ ان کے دل کی آرزو بھی نکل جائے تب منشی جی نے پیر بڑھا دیا۔ سو سبلا نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کئی بار غوراؤ کرتے ہوئے کہا تم بڑھ کر دوں گی اور دم کی دم میں دونوں پیر گرم قطروں سے تر ہو گئے۔ پتی برتا عورت نے پریم کے موتی شہر کے قایمیل پر منار کر دئے۔

جب دریا آدنا بلو میں ہوئی۔ تو اس نے برجن کا ایک ہاتھ پکڑ کر منشی جی کے ہاتھ میں دیا اور ہنہات صبحی آواز میں بولی۔ سو سوامی جی۔ آپ کے ساتھ بہت دن رہی اور زندگی کا بہت سکھ اٹھایا۔ اب پریم کا ناٹھ لڑتا ہے۔ اب میں دم بھر کی مہمان ہوں۔ پیاری برجن کو کہتیں سو نے جاتی ہوں۔ میری ہی نشوونما ہے۔ اس پر ہمیشہ مہربانی کی نگاہ رکھنا۔ میری قیمت میں اپنی پیاری بچی کا سکھ دیکھنا نہ لکھا تھا۔ اسے میں نے کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی کبھی کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ میری زندگی کا چل ہے ایسٹور کے لئے تم اس کی طرف سے بے شرم نہ ہو جاؤ۔ یہ کہتے کہتے پچکیاں



بندھ گئی اور غصنی سی لگائی

جب ذرا پھر فاقہ ہوا تو اُس نے سب اہل کے سامنے دونوں ہاتھ جوئے اور  
رو کر بولی: بہن! برجن تمہارے سپرد ہے۔ تم اُس کی ماں کی جگہ ہو۔ لہذا پیارے  
ایسٹوڈ کر کے تم جگ جگ جیو اپنی برجن کو بھلا لیا مت۔ وہ تمہاری غریب  
بے مال کی بہن ہے تم میں اُسکی جان بستی ہے۔ اسے رانا مارت کر ڈھانا مت۔  
اسے کبھی کڑی بات مت کہنا۔ اس سے کبھی نہ روٹھنا۔ اُسکی طرف سے بخیر نہ جوتا  
نہیں تو وہ مدد کر جان دیدیگی۔ اُس کے بھاگ میں نہ جانے کیا بد ہے مگر تم اسے  
اپنی سگی بہن سمجھ کر مدد اُس کی بد چوٹی کرتے رہنا میں ذرا دیر میں تم لوگوں کو پھوڑ کر  
چلی جاؤنگی۔ مگر تمہیں میری قسم اُسکی طرف سے من مٹانہ کرنا۔ تم نے اور تمہاری ماں  
نے اُسے آدمی بنایا ہے اور تمہیں اُس کا بیڑا پار لگاؤ گے۔ میرے دل میں بچے بچے  
ارمان تھے میری لالسا تھی کہ تمہارا بیاہ کرونگی تمہارے بچے کھلاؤں گی۔ مگر  
بھاگ میں کچھ اور ہی بد اٹھا۔

یہ کہتے کہتے پھر بیہوشی اور لقا ہٹ اس ریلوے کیا۔ ساڈا گھر رہا تھا۔  
مہر یاں۔ مہراجین۔ نوکر چاکر سب اس کا جس گھر رہے تھے۔ عورت نہیں دلیتی تھی  
ردھیا۔ اتنے دن ٹہل کرتے ہوئے مگر کبھی کڑی بات نہیں کہی۔  
مہراجن۔ ہم کو بیٹی کی طرح مانتی تھیں۔ کھانا کیسا ہی لپکا کے رکھ دوں مگر کبھی نہ بچ  
نہیں ہوئیں۔ جب بات کرتیں مسکرا کے۔ مہراج جب آتے تو انہیں جرد  
سیدھا لواتی تھیں۔

اسی طرح کی باتیں سب کر رہے تھے۔ وہی ہر کا دقت آیا۔ مہراج نے کہا

بنایا، مگر کھاتا کون۔ منشی جی بڑے اصرار سے کہنے اور منہ جو کھٹا کر کے چلے آئے پر تپا  
لے وہاں سے ٹپکے کی قسم کھالی تھی۔ برجن اور سُباما کو جھوک کر کہاں۔ سو سیلا کبھی  
برجن کو پیار کرتی۔ کبھی سُباما کو گلے لگاتی۔ کبھی برتاپ کی جو مستی اور کبھی اپنی بچی کہہ کر  
کے روتی۔ سہ پہر کے وقت اُس نے سب نوکرؤں کو بلوایا اور اُن سے خطامعات  
کر والی، چنبایہ سب چلے گئے تو سو سیلا سُباما سے ملتی۔ بہن پیاس بہت لگتی  
ہے، اُن سے کہہ دو ذرا اپنے ہاتھ سے پھر پانی پلاؤں۔ منشی جی پانی لائے اور سو سیلا  
نے ایک گھونٹ پش کل تمام حلق کے نیچے اتارا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا اسے کسی نے  
اسرت پلندہ اُس کا چہرہ روشن ہو گیا آنکھوں میں تلک بھرا یا شہ ہر گنگے میں ہاتھ  
ڈالکر پھل۔ میں کیسی بھانکوان ہوں کہ تمہاری گود میں مرنی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چپ  
ہو گئی۔ جیسے کوئی بات کہہ رہی ہوتی ہے وہ لحاظ سے نہیں کہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس  
نے پھر منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: ”اگر تم سے کچھ مانگوں تو دو گے“

منشی جی نے متعجب ہو کر کہا: ”تمہارے لئے مانگنے کی ضرورت ہے، شوق سے کہو“  
سو سیلا:- ”تم میری بات کبھی نہیں مانتے تھے۔“

منشی جی:- ”مرنے دم تک کبھی نہ مانوں گا۔“

سو سیلا:- ”ڈر لگتا ہے۔ کہیں نہ مانو تو۔۔۔“

منشی جی:- ”تمہاری بات اور میں نہ مانوں۔“

سو سیلا:- ”میں تمکو نہ چھوڑ رہی۔ ایک بات بتا دو، سلی مر جائیگی تو اسے بھیل جائے؟“

منشی جی:- ”ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو برجن روتی ہے۔“

سو سیلا:- ”بتلا دو مجھے بھولو گے تو نہیں؟“

منشی جی تمہاری یاد مرتے دم تک تازہ رہیگی۔

سوسیلہ نے اپنے مڑھیلے رخسارے منشی جی کے ہونٹوں پر رکھ دئے اور دونوں  
ہاتھیں انکے گلے میں ڈالیں۔ پھر راجن کو قریب بلا کر آہستہ آہستہ سمجھانے لگی۔ دیکھو  
بیٹی۔ للہ جی کا کہنا سہو ماننا۔ ان کی سیوا خوب من لگا کر کرنا۔ گھر کا سارا بوجھ اب  
تمہارے ہی اوپر ہے۔ اب تمہارے سوا کون سنبھالے گا۔

یہ کہہ کر اس نے خوشی کی عزت دردا میزنگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”میں اپنے من  
کی بات نہیں کہنے پائی۔ حق دو یا ہمارا ہے۔“

منشی جی۔ تم ناحق پس و پیش کرتی ہو۔

سوسیلہ۔ تم میرے ہو کہ نہیں؟

منشی جی۔ تمہارا اور مرے دو تک تمہارا۔

سوسیلہ۔ ایسا کہہ کر عین بی بی خاؤ اور جو چیز میو تھی وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے۔

منشی جی (اشدہ ہنسنے کے ساتھ)۔ اب کیا کریں کرتی ہو یہ تک چوٹ لگنا ہمارا ہی ہونگا۔

سوسیلہ نے راجن کو پھر بلایا اور بایکے درمیان پر گرا دیا اور اسے صاف کے میدان

ہو گئی۔ راجن اور پرتاپ روتے روتے سب لپٹنے لپٹنے لپٹے ہوئے چرائے کچھ گیا۔ منشی

جی نے کانٹے پر بیٹھ کر سوسیلہ کو سوسیر پر باندھ رکھا۔ سالس دھیرے دھیرے چل رہی تھی

مہراجن کو بلا کر کہا اب انہیں اپنی پرانی دوسریہ کہتے ہوئے بے اختیار روئے لگے۔

مہراجن اور سب مانے ملکر ریسر، کٹرین پریشاد ویتھ سپر دق نے بھیل تک مسکھا  
ڈالی تھیں۔

اندھیرا سوجھلا تھا۔ سارے کمرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جس ترنگ سناٹا۔

وحشت ناک ساٹا۔ وہ ساٹا جو دلوں کو طویل اور متھکا بنا دیتا ہے۔ رونے والے لڑتے تھے۔ مگر گلابا دبا کر۔ باتیں ہوتی تھیں مگر دبی آوازوں میں۔ سوسیلہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تن نازک جو کبھی مال کی گود میں پلا۔ کبھی محبت کے آغوش میں لپیٹا۔ کبھی بچوں کے سچ پر سویا۔ اس وقت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ابھی تک نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ منشی جی فرط الم و یاس سے خاموش اس کے سر پر ہاتھ بیٹھتے ہوئے تھے۔ دفعتاً سوسیلہ کے اعصاب میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے سر اٹھا دیا اور دونوں ہاتھوں سے منشی جی کا پیر پکڑ لیا۔ اور رُوح پدا کر گئی۔ دونوں ہاتھ ان کے پیروں کا حلقہ بنے ہی رہ گئے۔ یہ زندگی کا آخری کام تھا۔

رونے والو! روؤ۔ کیونکہ سوائے رونے کے اور تم کو یہی کیا جاسکتا ہو تمہیں اس وقت کوئی کتنا ہی سمجھا۔ مگر تمہاری آنکھیں آنسو کی بلندہ کو نہ روک سکیں گی۔ دوناتما را فرض ہے۔ زندگی میں رونے کے موقعے شاذ ہی ملتے ہیں۔ کیا اس موقع بھی تمہاری آنکھیں بھل کر جائیں گی۔ آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ ہر سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہ ہمارا جن چراغ جلا کر لمرہ میں لائی۔ ذرا دیر پہلے سوسیلہ کی زندگی کا چراغ مجھ چکا تھا

## برجن کی رخصتی

راہنما چرن رنگی کان لے سے نکلتے ہی مراد آباد کے انجنیئر مقرر ہو گئے۔ اور چند اُن کے ساتھ مراد آباد کو چلی۔ پریمیوں نے بہت دکانا چاہا۔ مگر چلنے والے کو کون روک سکتا ہے۔ سیویں کب کی سسرال جا چکی تھی۔ یہاں گھر میں اکیلی پریمی رہ گئی۔ اُسی کے سرگھر کا کام کاج۔ آخریہ رائے ہوئی کہ برجن کی رخصتی کا پیغام دیا جائے۔ ڈپٹی صاحب رخصتی کے سعادت غلام تھے۔ مگر گھر کے معاملات میں پریمی کا حکم قطعی ہوتا تھا۔

سچیون لال نے پیغام منظور کر لیا کچھ دنوں سے وہ تیرتھ جاتا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سو سولہ کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے تمام دنیاوی تعلقات ترک کر دیے تھے۔ دن بھر کمرہ میں آسن مائے بھگوت گیتا اور لوگیشٹ اور دوسری معرفت کی کتابیں کا مطالعہ کیا کرتے۔ شام چوتے ہی گنگا اشنان کو چلے جاتے۔ وہاں سے رات گئے۔ نوٹے اور دو چار لٹھے کھا کر سو جاتے۔ اکثر پرتاپ چند بھی اُن کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا اور اکثر وہ سولہ سال کا بھی نہ ہوا تھا مگر مناسبت فطری کہ زیادہ پیدی یا فیض صحبت کہ ابھی سے اُسے اسرار معرفت پر غور و خوض کرنے میں بید لطف حاصل ہوتا۔ گیان اور حقیقت کے تذکرے سننے سے اُس کا رجحان بھی بھگت کی جانب ہو چلا تھا۔ اور بعض اوقات منشی جی سے ایسے دقیق

مسائل پر بحث کرتا کہ وہ حیرت میں آجاتے۔

برج رانی پر شباما کی تعلیم کا اُس سے بھی گہرا اثر پڑا تھا جتنا پرتاپ چند پریشی جی کی صحبت اور تعلیم کا۔ اُس کا پندرہواں سال تھا جو ہمارے یہاں شباب کی پہلی منزل سمجھی جاتی ہے۔ اس سن میں لڑکیوں پر شوقِ شادگار کا جنون سوار ہوتا ہے۔ ان کے انداز اور طریق میں بجائے طفلانہ شوخی کے ایک مناسبت آمیز چلبلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ دلیں میں شباب کا، اُمنگیں لہرے مارنے لگتی ہیں اور نگاہوں میں سے بچائے سادگی اور شوخی کے ایک جذبہ آمیز رسیلا پن برسنے لگتا ہے۔ برج رانی ابھی تک وہی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ معصومیت کی تصویر تھا۔ ایک ایک انداز سے سادگی ٹپکتی تھی۔ ہاں رفتاریں ایک دلکش دھیراں اور طرزِ کلام میں لہجہ انواری شیرینی پیدا ہو گئی تھی۔ اُسکی باتیں سننے والے پر وہی منتر پڑھ دیتی تھیں منہ اندھیرے اُٹھتی اور سب سے پہلے فتنی جی کا کمرہ صاف کر کے اُن کے پوجا پاٹ کا سامانِ قرینہ سے دکھدیتی۔ پھر رسوئی کے دھندے میں لگ جاتی۔ دوپہر کا وقت اس کے لکھنے پڑھنے کا تھا۔ شباما سے اُسے جتنی محبت اور عقیدت تھی اتنی شاید اپنی ماں سے بھی نہ رہی ہو۔ اُسکی مرضی برجن کے لئے قانون تھی۔

شباما کی تو صلاح تھی کہ ابھی رخصتی نہ کی جائے مگر فتنی جی مفرح ہوئے اور بدائی کی تیاریاں ہونے لگیں بچوں جوں وہ مصیبت کی گھڑی سرسپائی جانی برجن کی بقراری بڑھتی جاتی۔ رات دن رویا کرتی۔ کبھی باپ کے پیروں پڑتی۔ کبھی شباما کے پیروں سے لپٹ جاتی مگر سیاہی لڑکی بڑے گھر کی ہو جاتی ہے۔ اس پر کسی کا کیا اختیار پرتاپ چند اور برجن کہتے ہی دلوں تک بھلائی ہنوں کی طرح ایک ساتھ رہے تھے

گراپ برون کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی نیچے کو جھک جاتیں۔ پرتاپ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں بہت سک آتا، کسی ضرورت کے آتا تو پھر اس طرح نگاہیں نیچے کئے اور سیمٹا ہوا گویا کہ نہیں ہے، اسکی ان نگاہوں میں وہ راز محبت چھپا ہوا تھا جسے وہ کسی شخص سے نہ کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ رخصتی کو دس تین دن ہو گئے تھے۔ پرتاپ کسی ضرورت سے اندر گیا اور اپنے کمرے میں لمپ جلانے لگا کہ برون آئی۔ اُسکا آہلی آئینہ سے تیر تھا۔ اُس نے آج دوسرے کے بعد پرتاپ کی طرف پرتاپ کی نگاہوں کو دیکھ کر کہا: ”لو مجھ سے کیسے صبر ہو گا!“

پرتاپ نے مردانہ ضبط سے کام لیا، اُسکی آنکھوں میں آنسو نہ آئے، اُسکی آواز بھاری ہوئی۔ ”واغظانہ لہجہ میں بولا۔“ ”ایسٹور تمہیں صبر کی طاقت دیگا۔“

برون کی گردن جھک گئی، آنکھیں زمین میں گر گئیں اور ایک لمبی ہونٹیں سسکی لے حسرت و درد کا وہ دفتر بیان کر دیا۔ جو زبان سے ناممکن تھا۔

”رخصتی کا دن لڑکیوں کے لئے عجیب حسرت کا دن ہوتا ہے۔ بچپن کی سکھیاں۔ سہیلیاں۔ ماں باپ۔ بھائی بند گھر کے انوس فر دیا اور اسی سبب ناظم لوٹ جاتا ہے یہ خیال کہ میں پھر اس گھر میں آؤنگی اُسے مطلق تسکین نہیں دیتا۔ کیونکہ اس آہنگی کو وہاں کی حیثیت سے آئیگی۔ اُن لوگوں سے جدا ہونا جو کہ درمیان زندگی کے گوارے میں کھیلنا اور فیکر لیں کے چمن میں میر کرنا نصیب ہوا ہو۔ اُس کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اب تک وہ دُنیل کے ذوالن اہل بنیاد سے آنا دہتی تھی۔ مگر آج سے اس کے سر پر ایسا بوجھ ملتا ہے جو مرنے تک اٹھانا پڑیگا۔“

برجن کا صند گار کیا جا رہا تھا۔ نائین اُس کے پیروں میں مہا اود چلا رہی تھی  
 کوئی اُس کے سر کے بالوں کو نہ دھری تھی۔ کوئی جوڑے پتھر عطر لپا رہی تھی مگر جس  
 کے لئے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں وہ زمین پر موتی کے دانے یوں بکھیر رہی تھی  
 گویا اسکا کچھ مل ہی نہیں ہے اتنے میں باہر سے پیغام آیا۔ ساعت ملی جا رہی ہے  
 جلدی کر۔ سب لانا اس کھڑی تھی۔ برجن اس کے گلے لپٹ گئی۔ اودہ جوش گریہ جو  
 اب تک دبی ہوئی آگ کی طرح سلگ رہا تھا ایک بارگی یوں ابل پڑا جیسے کوئی آنکھ میں  
 تیل ڈال دے۔

فدا دیر میں پالکی معاذہ پر آئی۔ برجن پاس پڑوس کی عورتوں سے گلے ملی۔  
 سب لانا کے پیر چھوئے اور تب دو تین عورتوں نے اُسے پالکی کے اندر بٹھا دیا۔ اُدھر  
 پالکی اُٹھی اودھر سب لانا عیش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ گویا اُس کے جیتے جی کوئی اُسکی  
 جان نکال کر لئے جاتا تھا۔ گھر سوتا ہو گیا۔ سینکڑوں عورتوں کا جھگمٹ تھا۔  
 مگر ایک برجن کے نہ ہونے سے مکان چھاٹ سکھاتا تھا۔



## کملہ چرن کے دوست

جیسے سینہ درد کی سرخی سے مانگ بوج جاتی ہے اُسی طرح برج رانی کے لئے سے پریمیوں کے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی۔ بٹا مالے اُسے ایسے گن سکھائے تھے کہ جس نے اُسے دیکھا مودہ کیا۔ یہاں تک کہ سیوٹی کی سہیلی رانی کو بھی پریمیوں کے سامنے اقرار کرنا پڑا کہ تمہاری چھوٹی بہن تو ہم سبھیل کانگ پھیکا کر دیا۔ سیوٹی اُس سے دن دن بھر بات کرتی۔ اور اُس کدھی نہ بھرتا۔ اُسے اپنے گالے پہنا دیتا تھا۔ مگر اس میلان میں بھی بہن بازی لے گئی۔

اب کملہ چرن کے دوستوں نے تقاضا کرنا شروع کیا کہ ابھی نئی دہائی گھر میں لائے ہو کچھ دعوت جلسہ کی بھی فکر ہے۔ سنتے ہیں نہایت حسین بیوی پائی ہے۔ کملہ چرن کو بوسہ تو سسالی میں ملا تھا۔ جب تک کہ نکما کر لے۔ "اجی دعوت لو۔ خیر میں ملاؤ ان نکمیں سیکو۔ ہاں بہت ہو سکتی نہ جانا ہند کہیں اندلہ خیر ہو تو۔ تمہیں یہ شہنا ہے۔ جیتے وہ گھر میں پائی ہیں ایجاںب کا قافیہ تنگ ہے۔ سنتا ہوں انگریزی۔ فارسی۔ سنسکرت الم غلم سب گھولے ملٹی ہے۔ ڈتا ہوں کہیں انگریزی میں پوچھ بلٹی یا فارسی میں بات چیت شروع کر دی تو سوائے بغلیں جھا مکنے کا اور کیا کر دینگا۔ اسلئے ابھی کئی کاٹا پھرتا ہوں۔"

یوں تو کملہ چرن کے دوستوں کی تعداد لامودہ تھی۔ شہر کے جتنے کبوتر باز۔

کلوے باز۔ شہدے تھے سب اُن کے دوست۔ مگر دلی دوستوں میں شہر باج آدمی تھے اور سب کے سب فاقہ مست۔ آواران میں سب سے زیادہ تعلم یافتہ میل مجید تھے۔ پکھری میں عرائض تو ایسی کیا کرتے تھے جو کچھ ملتا وہ سب شراب کی نذر کرتے۔ دوسرا مخیر حمید خاں کا تھا۔ ان ذات شرعیہ کے دفتر میں بڑی دولت پائی تھی مگر تین سالوں میں سب کچھ ارباب نشاط کی نذر کر دیا۔ اب یہ وطن تھا کہ شام کو سچ دھج بنا کر گلیوں کی خاک چھاتے پھرتے اور دقتِ ضرورت پر بانداہ حسن کی دلائی بھی کیا کرتے تھے۔ اس بازار کے خریداروں اور بیویا لیل میں اُن کی بڑی رسائی تھی تیسرے حضرت سعید حسین تھے۔ ایک ہی شاعر تھا بازار۔ سینکڑوں کے داؤ لگانے والے۔ بیوی کے نیچوں پر ہاتھ صاف کرنا ہنجرہ کا مشغلہ تھا۔ باقی دو صاحب رام سیوک اور چنل لال پکھری میں ملازم تھے۔ تنخواہیں تھوڑی مگر بالائی رقم وافر نصف، شراب کو نذر کرتے اور نصف مشاہدانِ حسن فروش کی خاطر مدارت میں صرف ہوتی۔ گھر کے لوگ فاقے کرتے یا بھیک مانگتے۔ انہیں صرف اپنے عیش سے کام تھا۔

مشورہ تو ہم ہی چکا تھا۔ آٹھ بجے جب ڈپٹی صاحب لیٹے تو یہ پانچوں حضرات جمع ہوئے اور دور چلنے لگا۔ پانچوں پیسے میں حاتم تھے۔ دائم الحزب جب ذرا سڑا گھاٹا تو بہکی بہکی باتیں ہونے لگیں۔

مجید۔ کیوں بھئی کلا چرن! سچ کہنا دیکھ کر جی خوش ہو گیا یا نہیں؟  
 کلا۔ اب آپ ہمکنے لگے کیوں؟  
 رام سیوک۔ بتلا کیوں نہیں دیتے۔ اس میں بھینپنے کی کیا بات ہے؟

کملا - بتلا کیا اپنا سر دلوں کبھی سامنے جانے کا اتفاق بھی تو ہوا ہو۔ کل کھار کی دراڑ سے ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ ابھی تک تصویر نگاہوں میں پھر رہی ہے۔

چندو لال - میرے بار تو بڑا بلند تھا قبل ہے۔

کملا - ایسا بے قرار ہوا کہ گرتے گرتے بچا۔ بس پری سمجھ لو۔

مجید - تو بھی یہ دوستی کس دن کام آئیگی۔ ایک نظر میں بھی دکھاؤ۔  
سعید - بیسٹ دوستی کے یہی معنی ہیں کہ آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔ دینی کا مسئلہ ہی القاف ہو جائے

چندو لال - دوستی میں کیا پردہ۔ انگریزوں کو دیکھو۔ بیوی ڈولی سے اتری نہیں کہ یا دوست ہاتھ ملانے لگے۔

رام سیوک - مجھے تو بن دیکھے چلن نہ آئیگا۔ ہنس تو چلتے؟

کملا - ایک دھول لگا کر زبان کاٹ لی جائیگی سمجھے۔

رام سیوک - کچھ پتا نہیں۔ آنکھیں تو دیکھنے کو رہیں گی۔

مجید - بھی کملا چرن برامانے کی کوئی بات نہیں۔ اب سوقت تمہارا فرس ہے کہ دوستوں کی فرمائش پوری کرو۔

کملا - اسے تو میں انکار کیا کرتا ہوں۔

چندو لال - واہ میرے شیرزیہ مردوں کی سی باتیں ہیں۔ تو ہلوگ بن ٹھن کر آجائیں کیوں؟

کملا - جی ذرا منہ میں کالکھ لگا لیجیگا۔ بس اتنا کافی ہے۔

سعید - تو کاخیر میں تاجیر کیوں ہو۔ آج ہی کی ٹھہری تہ؟

کھلا۔ آج ہی سہی مگر یاد رہے کل آپ سربِ معصوب کی بیویوں کے دشمن کرونگا اس وقت اگر کسی نے چپیں چپڑکیا تو بندہ کا پاپوشِ مہیا تک ہوگا اور اُس کلنر کو نامبارک۔

سب کے سب :- منظور پٹیل و جاں منظور۔

رام سینیوک :- یہاں کیا دھڑا ہے۔ پانچ بج چل کی ماں۔ اس پر بیٹے حالِ خاصِ حیریل ہو رہی ہے۔

چندو لال :- یہاں اس سے بھی بدتر حال ہے۔ تین مہینہ سے چوتھیا آرہا ہے مگر کس مردِ دود نے ایک کوٹنی کی بھی دوا لی ہو۔ میٹر دیکھتے ہی بخار چڑھتا ہے۔ سعید :- اینجا ب یہ روگ ہی نہیں پالتے ہیں چندو زہ انتظام مستقل انتظام سے بہتر ہے۔

ادھر تو مٹے ناب کے دھڑپل رہے تھے۔ ادھر رحمن پٹنگ پر لٹی ہوئی خیریل میں غرق تھی۔ بچپن کے دن کیلے اچھے ہوتے ہیں۔ کاش وہ دن پھر آجائے۔ آہ کیسی دلچسپ زندگی تھی دنیا ناہ۔ پیاد اور محبت کا گہوارہ تھی۔ کیلواہ کوئی دوسری دنیا تھی کیا ان دنوں دنیا کی چیزیں بہت ہی بصورت ہوتی تھیں۔ انہیں خیالوں میں آنکھ نہ اٹھک گئی اور بچپن کا ایک اقبہ پیش نظر ہو گیا۔ اللہ نے اُسکی گڑباز روٹی اُس نے اُس کی کتاب کے وہ ورق بھاڑ ڈالے۔ تب اللہ نے اُسکی بھٹی میں زور سے چٹکی لی اور باہر نکال دیا۔ وہ بٹکے لگی۔ اور لالو کو کوس رہی تھی کہ سبلا اُسکا ہاتھ پکڑے ہنسنے لگی اور بولی :- کیوں بیٹی اُس نے تمہیں مارا ہے نا؟ یہ بہت مارا کر بھگتے ہیں۔ آج انکی حرکت کمزوری ہوئی۔ دیکھو کھلا مارا ہے۔" لالو نے ڈیباٹی

آنکھوں سے برجن کی طرف دیکھا اور برجن نے مسکرا کر کہا : ”مجھے انہوں نے کہاں مارا۔ یہ مجھے کبھی نہیں مارتے۔“ یہ کہہ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنے حصّہ کی میٹھائی کھلائی۔ اور پھر دونوں ملکر کھیلنے لگے۔ وہ زمانہ اب کہاں؟ اُس زمانہ کی یاد ایک خوابِ حسرت کی یاد ہے۔

راتِ نیادہ گزر گئی تھی۔ یکایک برجن کو ایسا معلوم ہوا کہ سلسلے والی لڑکی کوئی دھندھا رہا ہے۔ اُس نے کان لگا کر سُنا۔ برابر آدائیں آرہی تھیں کبھی رگ جاتیں۔ پھر آنے لگتیں۔ دُور دیر میں مٹی گرے لگی۔ خیریت کے بدلے برجن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی کڑا کر کے اُٹھی اور مہر جن کو خیمہ چھوڑنے لگی۔ گھٹکی بندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلہ سامنے گرا اور مہر جن چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ دونوں کو یقین ہو گیا کہ چور آئے ہیں۔ مہر جن ایک ہی چالاک عورت تھی سمجھی کہ چلو لگی تو جاگ ہو جائیگی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ چور پہلے سینہ میں پیر ڈال کر دیکھتے ہیں تب خود گھستے ہیں۔ اُس نے ایک ڈنڈا اٹھالیا کہ جب پیر ڈالیں گا تو ایسا تاک کر مار دوں گی کہ ٹانگ ٹوٹ جائیگی۔ مگر چور نے پیر کے بجائے سینہ میں سے سر باہر نکالا۔ مہر جن تاک میں تھی ہی ڈنڈا چلا دیا اور کھٹ کی آواز آئی۔ چور نے فوراً سر کھینچ لیا۔ اور یہ کہتا ہوا سُنا دیا : ”اُف! اُف! اُف! لا بھیر بھیر بھنا گئی۔“ پھر کئی آدمیوں کے بیٹھنے کی آواز آئی اور اس کے بعد سنا ہوا گیا کہ اپنے میں اور لوگ جاگ پڑے اور باقی رات گپ شپ میں گئی۔

سویرے جب کھلا چرن گھر میں آئے تو آنکھیں سرخ تھیں اور سر میں آہاس تھا۔ مہر جن نے نرمویک جاکر دیکھا اور آکر مہر جن سے بولی :- ”بہو ایک

بات کہوں۔ برا لڑنا لگی۔  
 برجن۔ برا کیوں مانو تگی۔ کہو۔ کیا کہتی ہو؟  
 مہراجن۔ رات جو سینہ پڑی تھی وہ چوروں نے نہیں لگائی تھی۔  
 برجن۔ پھر کون تھا؟  
 مہراجن۔ گھڑی کے بھیدی تھے۔ باہری کوئی نہیں تھا۔  
 برجن۔ کیا کسی کہا رکی شراست تھی۔  
 مہراجن۔ نہیں۔ کہا روں میں ایسا کوئی نہیں ہے۔  
 برجن۔ پھر کون تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔  
 مہراجن۔ میری بھلن میں تو چھوٹے بالو تھے میں نے وہ لکڑی نہیں پھینکی تھی  
 وہ اُن کے سر میں لگی۔ سر پھولا ہو رہا ہے۔  
 اتنا سنتے ہی برجن کے تیو تبدیل گئے اور چہرہ تہمتا گیا۔ غصہ اک ہو کر بولی  
 "مہراجن! ہوش سنبھال کر باتیں کرو۔ تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔  
 تمہیں میرے سے ایسی بات کہنے کا حوصلہ ہوا، خود میرے سر پر الزام تھوپ  
 رہی ہو۔ تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے۔ ورنہ سیو وقت تمہیں یہاں سے کھڑے  
 کھڑے نکلوا دیتی۔ تب تمہیں معلوم ہوتا کہ زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا یہ پھل ہوتا ہے  
 یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ مجھے تمہاری صورت دیکھ کر تجارہ سا پٹھ رہا ہے۔ تمہیں  
 اتنا نہ سمجھ پڑا کہ میں کیسی بات زبان سے نکال رہی ہوں۔ اُنہیں الیشو نے  
 کیا نہیں دیا ہے۔ سارا کھر اُن کا ہے۔ میرا جو کچھ ہے۔ اُنکا ہے۔ میں خود  
 اُن کی چیری ہوں۔ اور اُن کی کسبت تم ایسی بات کہہ بیٹھیں۔

مگر خُص بات پر بوجن ایسی برہم ہوئی اسی بات پر گھر کے دوسرے آدمیوں  
کو آسانی سے یقین آ گیا۔ ڈپٹی صاحب کے کال میں بات پہنچی، وہ گملا  
چرن کو اس سے زیادہ شریر النفس سمجھتے تھے، جتنا وہ فی الواقع تھا۔ خوف  
ہوا کہ کہیں یہ حضرت بہو کے زلیدل پر ہاتھ صاف کریں۔ بہتر ہے کہ انہیں  
بلوڈنگ ہاؤس بھیج دوں۔

گملا چرن نے یہ تجویز سنی تو بہت چہینے چلائے۔ مگر کچھ سوچ کر دوسرے  
دن بلوڈنگ ہاؤس چلے گئے۔ بوجن کے آنے سے پہلے کئی بار یہ تجویز ہوئی تھی مگر  
گملا کی ضد کے سامنے ایک بھی پیش نہ گئی۔ یہ بیوی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جانے  
کا خوف تھا۔ جواب کی بار اسے بلوڈنگ ہاؤس لے گیا۔



## کلایا پلٹ

یہ بلادن کو کملاچرن نے کسی طرح بورڈنگ ہاؤس میں کانا صبح سے شام تک پڑے سویا کئے۔ دوسرے دن خیال آیا کہ آج تو نواب صاحب ادھیکھے مرزا کے بیٹیوں میں بدامواجوڑ ہے۔ کیسے کیسے ست پٹھے ہیں کہ دیکھ کر روح وجد کرنے لگے۔ آج انکی پکڑ دیکھنے کے قابل ہوگی۔ شہر کا شہر چھپ پڑے تو عجب نہیں۔ چہ خوش۔ شہر کے لوگ تو بہانہ ڈائیں اور میں یہاں کتابوں سے سر لڑاؤں۔ یہ سوچتے سوچتے اٹھاؤں دم کی دم میں بیان کے موقع پر تھا۔

یہاں آج خلقت کی خلقت جمع تھی۔ خاصہ میلہ لگا ہوا تھا سقے چھڑکاؤ۔ گھر سے تھے سگرٹ والے۔ کتاب والے۔ مہتممی سب اپنی اپنی دکانیں لگا کر بیٹھے تھے اور شہر کے رنگین مزارق نو جوان ہاتھوں میں بیٹری لے کر یا مٹھی ادوں پر بلبوں کو بٹھائے مٹر گشت کر رہے تھے۔ کملاچرن کے دوستوں کی اس جگہ کیا کمی۔ لوگ انہیں غالی ہاتھ دیکھتے تو زیرت سے پوچھتے۔ اے راجہ صاحب! آج خالی ہاتھ کیسے۔ اتنے میں میاں سعید مجید جمید وغیرہ نشہ میں جو سگرٹ کے کٹھنیں ہکا بھکا اٹلے نظر آئے۔ کملاچرن کو دیکھتے ہی سب کے سب سر پٹ دوڑے اور پانچوں کے پانچ عیوب شرعی کی طرح ان سے پلٹ گئے۔

مجید۔ آج تم کہاں غائب ہو گئے تھے میاں! بقرآن کی قسم مکان کے سیکرہوں



چکر لگائے ہوں گے

رام سیدوک آج کل عید کی راتیں ہیں بھی آنکھیں نہیں دیکھتے ششہ سا چڑھا ہوا ہے۔  
چند لال چین کر رہا ہے پٹھان جیسے نازنین گھر میں آئی ہے اس مرد خدا نے  
بازار کی منہ دت تک نہیں دیکھی جب دیکھے گھر میں گھسا رہتا ہے خوب  
چین کر لے یار۔ دوستوں کی طرف سے بھی بوسے لے لیا کر۔

کمالا۔ چین کی خاک کروں۔ یہاں توقید میں پھنس گیا تین دن سے لورڈنگ میں پڑا ہوں  
مجید۔ ارے! خدا کی قسم!

کمالا۔ تیری جان کی قسم۔ اسی سے مٹی ملید میری ہے۔ آج سبھوئی آنکھیں بچا کر نکل بھگا۔  
رام سیدوک۔ اُف! مصیبت سی مصیبت ہے۔ مگر یار خوب اڑے۔ وہ چھتہ  
سپرٹنٹ جھلا رہا ہوگا۔

کمالا۔ اس معرکہ کے چوڑے چھوڑ کر کتابوں میں سرکون مائل اسکی مدتوں سے آرزو تھی۔  
سعید۔ یار آج اٹائے تو کیا حق یہ ہے کہ تمہارا دل رہنا سہنا ہے۔ ذلت تو نہ اُسکو گے  
اور یہاں آئے دن نئی نئی سیریں۔ نئی نئی دلچسپیاں۔ کل لال ڈگی پر۔ پرسوں  
مٹ پر۔ ترسوں بیڑے کا میلہ کہاں تک گناؤں۔

کمالا۔ کل کی کٹاؤ تو بندہ ضرور دیکھے گا۔ چاہے ادھر کی دُنیا ادھر ہو جائے۔  
سعید۔ اور ٹیڑوں کا میلہ نہ دیکھا تو حسرت رہ جائیگی۔

سعید کے وقت کمالا چین یاراں نہ خاطر سے رخصت ہو کر مادل نامخواستہ  
ڈاک باؤس کی عزت دار۔ دال میں ایک سجدہ سا بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ پر پہنچا جتا  
لگا میرٹنٹ صاحب۔ ہوں تو نہ۔ اگر وہ میں چلاؤں مگر دکھتا ہے تو وہ

بھی باہری کی طرف آ رہے ہیں۔ دل کو خوب مضبوط کر کے اندہ داخل ہوا سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے۔ ”اب تک کہاں تھے؟“

لہجہ ایسا درشت تھا کہ کھلا چہرہ پر مشکل تنکی بہ تنکی جواب دینے سے باز رہا۔ مغرورانہ انداز سے بولا۔ ”ایک ضرورت سے بازار چلا گیا تھا۔“

سپرنٹنڈنٹ۔ یہ بازار جانے کا وقت نہیں ہے۔  
 کھلا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ آئندہ سے احتیاط رکھوں گا۔

رات کو جب کھلا چار پانی پر لیٹا تو سوچنے لگا۔ یا آج تو بچ گیا مگر مرزا تو سب ہو کہ کل بھی بچوں اور رسول بھی حضرت کی آنکھوں میں جھاک ڈالیں۔ کل کا نظارہ واقعی قابلِ تہنیت ہو گا۔ کنکوے آسمان سے باتیں کریں گے۔ اڈ لمبے لمبے پیچ ہوئیں گے۔ نو شانہ مرزا بلا کی بازی لگا تا ہے۔ یہ خیال کرتے کرتے سو گیا اور دوسرے دن پھر علی القیاس بودنگ ہاؤس سے نکل بھاگا۔ بارانِ دلنواز لال دُگی پر اس کے منظر تھے دیکھتے ہی بارغ بارغ ہو گئے۔ اور پیچھے ٹھوکی

کھلا چہرہ کچھ دیر تک نوکٹاؤں دیکھتا رہا پھر شوق چڑا یا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے کنکوے منگواؤں اور اپنی تیز دستی کے کرتب دکھاؤں۔ سعید نے جھڑک دیا۔ بدیدہ کہ لڑاؤ۔ روپیہ ہم دینگے چوٹ آؤ دیکھا نہ ناؤ مکان پر آدمی دوڑا دیا کامل یقین تھا کہ اپنے ماتھے سے یہاں سھراؤ کر دوں گا۔ مگر آدمی مجھ سے خالی ہاتھ لوٹا۔ حضرت کو تاب نہ ہی۔ بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ہنٹر لیگ دوڑے اور مکان پر آئے ہی کہا دل کو ایک سر سے سے ہنٹر پٹ پٹنا شروع کیا۔ غریب بیٹے حقہ تمباکو کر رہے تھے۔ ہنٹر پٹے اور بے خطراتے قصور تو بچ نہیں مار مار کر روئے لگے۔ سارے محلہ میں ایک شور سا برپا ہو گیا کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہماری کیا خطراتے۔ یہاں

کہا اس کی خاطر خواہ مہرمت کو کے مکمل چرن اپنے کمر میں پہنچے۔ مگر وہاں کی کیفیت دیکھ کر غصہ بخار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ پتنگ پھٹے ہوئے تھے۔ چرخیاں ٹوٹی ہوئی اور لٹخے کی لٹخیاں اُلٹی ہوئیں۔ گویا کسی دہانے ان ہوائی جنگ آوروں کی ستیا اس کر دیا۔ سمجھ گئے کہ ضرور اماں نے یہ حرکت کی ہے۔ غصہ سے لہلہ اماں کے پاس گئے اور زور زور سے کہنے لگے۔ "کیوں اماں! کیا تم سچ بولی میری جان ہی لینے پہا لگتی ہو۔ تین دن ہوئے قید خانہ میں بھجوا دیا۔ مگر اتنے پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میری دلچسپی جو سامان تھے وہ سب برباد کر ڈالے۔ کیوں؟"

پریمیونی (ترجیرت) میں نے تو تمہاری کوئی چیز نہیں چھوئی۔ کیا ہوا؟  
گملا۔ (بگڑ کر) جھوٹوں کے منہ میں کیڑے پڑتے ہیں۔ اگر تم نے میری چیزیں نہیں چھوئیں تو کس کی مجال ہے جو میرے کمرہ میں جا کر میرے کنگوے اور چرخیاں سب توڑ پھوڑا۔ کیا اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا۔

پریمیونی۔ تمہارے سر کی قسم میں نے اس کمرہ میں قدم نہیں رکھا۔ چلو دیکھو کون کون چیزیں ٹوٹی ہیں۔

یہ کہہ کر پریمیونی قمار کمرہ کی طرف چلی اور مکمل غصہ میں بھرے آنکھوں میں کھڑے رہے کہ اتنے میں مادھوی برجن کے کمرہ سے نکلی اور ان کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیکر چلی گئی۔ لکھا ہوا تھا۔

خط میں لکھی ہے خطا دار ہو۔ سرزاد بچے جو سزا دار ہوں  
یہ پرنہ دیکھتے ہی مکمل بھیگی پٹی بن گیا۔ دلے پاؤں مردانے کی طرف چلا۔  
پریمیونی نے پردہ کی آڑ سے دیکھتے ہوئے لوگوں کو ڈانٹا ڈپٹا کر دے کیا تھا۔

اسے منع کیا۔ اور اسی وقت چند اور کنکوبے جو بیچے ہوئے تھے پھار والے چرخوں  
ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور دُور میں دیا سلائی لگا دی۔ ماں اُس کی یہ مجنونا نہ حرکت  
دیکھ ہی تھی۔ مجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ کہاں تو ابھی ابھی انہیں چرخوں  
کے لئے دنیا سر پہ اٹھالی اور کہاں خود ہی اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ سمجھی شاید  
مارے غصہ کے یہ حرکت کر رہا ہے۔ منانے لگی، مگر کھلا کے چہرے سے غصہ مطلق  
ظاہر نہ ہوتا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں غصہ میں نہیں ہوں۔ آج سے پکا ارادہ  
کر رہا ہوں کہ تپنگ کبھی نہ اُڑاؤنگا۔ میری حماقت تھی۔ کہ ان چیزوں کے لئے  
آپ سے جھگڑا بیٹھا۔“

جب کھلا چرخ نہ کرہ میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا۔ بیشک میرے کنکوبے  
اُڑانا انہیں ناپسند ہے۔ دل سلفرت کرتی ہیں۔ ورنہ مجھ پر یہ ظلم سرگز نہ کرتیں  
کاش ایک بار اُن سے ملاقات ہو جاتی تو پوچھتا کہ تمہاری کیا مرضی ہے۔ مگر کون منہ  
دکھاؤنگا۔ ایک تو کٹھ منخر اس پر اپنی حماقت کچھ کسی بات ثبوت ہے چکا۔ سینہ  
والے محلہ کی خبر انہیں ضرور ہی ہوئی ہوگی۔ انہیں صورت دکھانے کے قابل نہیں  
رہا۔ اب تو یہی علل ہے کہ یا تو انکی صورت دیکھیں اور نہ اپنی دکھاؤں یا کسی  
طرح کچھ علم حاصل کروں۔ ہائے ظالم نے کیسی صورت پائی ہے۔ عورت نہیں  
خود معلوم ہوتی ہے۔ کیا کبھی وہ دن بھی ہو گئے کہ میں اسے پیار کر ڈنگا اور میرے  
پیادے کے بدلے وہ بھی مجھے پیار کر لگی۔ اس وقت تو شاید میں شادی مرگ ہو جاؤں  
کیا سُرخ سُرخ ریلے ہونٹ ہیں۔ مگر ظالم ہے۔ رجم تو اسے پھونپھون نہیں گیا۔ کہتی  
ہے سزا دیجئے جو سزا فار ہوں۔ کیا سزائوں۔ اگر آجاؤ تو گلے سے لگاؤں اور

انگشت بوسے لوں۔ یہی تمہاری سزا ہے۔ اور بشرط زندگی کبھی نہ کبھی یہ سزا  
 دو گنا ضرور۔ اچھا تو اب آج سے پڑھنا چاہیے۔ نہ سوچتے سوچتے اٹھا اور  
 ڈربہ کھول کر کبوتروں کو اڑانے لگا۔ سیکڑوں ہی چوڑے تھے۔ ایک سے ایک  
 ہلکے چوڑے کر آسمان میں تارے بن جائیں۔ اُن میں تو دن بھر اترنے کا نام نہ لیں۔  
 شہر کے کبوتر باز ایک ایک چوڑے کے بدلے غلامی لکھانے کو تیار تھے۔ مگر  
 دم زدن میں سب کے سب اڑا دئے۔ جب ڈربہ صاف ہو گیا تو کہاوں  
 کو یہ حکم دیا کہ اسے اٹھا لیجاؤ اند آگ میں جلادو۔ ورنہ سب کبوتر اس پر  
 کر بیٹھیں گے۔ کبوتروں کا قصہ پاک کر کے بیڑوں اور بلبوں کی طرف مخاب  
 ہونے اند اُنہیں بھی بند نفس سے آزاد کر دیا۔

باہر تو یہ گل ہوا تھا۔ اندر پر یونی چھاتی پیٹ رہی تھی۔ کہ نہیں معلوم لڑکا  
 کیا کر لے پتا آیا ہے۔ برجن کو بُرا کر کہا۔ ”بیٹی، بچہ کو کسی طرح روکو۔ نہیں معلوم  
 اُس نے دل میں کیا ٹھانی ہے۔“ یہ کہہ کر وٹنے لگی۔ برجن کو بھی خشک ہو رہا  
 تھا کہ سروں ہوں نے کچھ اینرینٹ کی ہے ورنہ اس جھلاہٹ کے کیا معنی  
 گو کلمہ بد شوق تھا۔ بد اخلاق تھا۔ آوارہ تھا۔ مگر ان سب عیبوں کے ساتھ  
 اس میں ایک بڑا وصف بھی تھا جس کی کوئی عودت ناقدی نہیں کر سکتی  
 اسے برج رانی سے سچی محبت تھی اور اس کا نادارستہ طور پر کئی بار اظہار  
 ہو چکا تھا یہی سبب تھا جس نے برجن کو اتنا دلیر بنا دیا تھا۔ اُس نے  
 کاغذ نکالا۔ ادھیہ پڑتہ لکھ کر باہر بھیجا۔

پیارے! یہ خفگی کس پر ہے۔ کیا مجھ پر اور محض اسلئے کہ میں نے محبت

کر کے دہلیں نکو سے پھاڑ ڈالے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی سی بات پر ایسے  
برگشتہ ہو جائیں گے تو ہرگز انہیں ہاتھ نہ لگاتی مگر اب خطا ہو گئی، معاف فرمائیے  
یہ پہلی خطا ہے

ایک کی برج رانی

کھلا جہنم یہ خطا یا کر ایسا خوش ہوا تو یاساری دنیا کی دولت ہاتھاگ  
گئی، جواب دینے کا شوق چرایا مگر قلم ہی نہیں اٹھتا۔ نہ القاب ملتا ہے۔ نہ  
آداب۔ نہ اٹھان کا خیال ہوتا ہے۔ نہ خاتمہ کا۔ ہر چیز چاہتا ہے کہ کوئی عاشق  
لنگ کا پھر کرے، ہوا خط لکھیں، مگر عقل خدا بھی نہیں دوڑتی۔ آج پہلی بار مکمل  
جہنم کو اپنی بے علمی اور جہالت پر روٹا آیا۔ افسوس! میر ایک سیدھا سا خط  
بھی نہیں لکھ سکتا، اس خیال سے وہ رونے لگا۔ اور کمرہ کے دروازے بند  
کر لئے کہ کوئی دیکھ نہ لے

سہ پہر کے وقت منشی شیلیا جہنم گھر پر آئے تو سب سے پہلی چیز جو نظر  
پڑی وہ آگ کا لاؤٹھا۔ لوکر دل سے منتحب ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیسا لاؤٹھا ہے؟“  
لوکر دل نے جواب دیا۔ ”محفوظ ڈیرہ جل رہا ہے۔“

منشی جی۔ (گھر تک کر) اسے کیوں جلائے ہو، کدوتر کہاں رہیں گے؟  
کہا۔ ”چھوٹے بابو کا حکم ہے کہ سب ڈیرے جلا دو۔“  
منشی جی۔ کدوتر کہاں گئے؟

کہا۔ ”سب اٹا دئے ایک بھی نہیں رکھا، کنکو سے سب پھاڑ ڈالے۔ دو  
جلادی۔ بڑا نکسان کیا۔ کہا نے اپنی دانست میں مار پیٹ کا بدلہ لیا۔ غریب

سمجھا کہ منشی جی اس نقصان کے لئے کملا چرن کو سخت سُست کہیں گے مگر منشی جی نے یہ ماجرا سُنا تو سکتے میں آ گئے۔ انہیں جانندوں پر کملا چرن جان دیتا تھا۔ آج بیکار کیا کیا پلٹ ہو گئی۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ کہاار سے کہا بچہ کو بھی بد۔ ایک منٹ میں کہاار نے آکر کہا۔ ”ہجھو درو جا بند ہے اندر سے۔ بہت کھٹکھٹایا کھولتے ہی نہیں۔“

اتنا سُنا تھا کہ منشی جی کا خون خشک ہو گیا۔ ذرا شبہ ہوا کہ بچلے نے نہ کھالیا۔ آج ایک نہر خدنی کا مقدمہ فیصل کر کے آئے تھے۔ نیگے پاؤں دوڑے ادب منکر کے عدوانہ پرندہ سے ملات مار کر کہا۔ ”بچہ! بچہ!“ یہ کہتے کہتے گلا چنسن گیا کملا نے باپ کی آواز سُنی تو فوسا آسنو پونچھو لے ادا ٹھکر دیا اور کھول دیا اگر اُسے کتنا تعجب ہوا جب منشی جی نے بچلے لعن طعن کرنے کے اُسے سینہ سے لپٹ لیا اور گھبرا کر پوچھا۔ ”بچہ! تمہیں میرے سوا کس قسم بتا دوں نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟“

کملا چرن نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کیلئے منشی جی کی طرف آنکھیں اٹھائیں تو اُن میں آنسو تھے۔ منشی جی کو اب یقین کامل ہو گیا کہ ضرور آفت آ گئی۔ ایک کہاار سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب کو بللا۔ کہنا ابھی چلئے۔“ اب جل کے کنڈھن کملا پاپکا اس گھبراہٹ کا مطلب سمجھا۔ دوڑ کر اُن سے لپٹ گیا۔ ادب بولا۔ ”آپ کا شبہ بالکل بیکار ہے۔ آپ کے سر کی قسم میں بالکل اچھا ہوں“ مگر ڈپٹی صاحب کے ہوش اُٹھ گئے تھے۔ سمجھے یہ مجھے روک کر دیر کیا جاتا ہے۔ تاکہ اپنا کام تمام کر لے۔ منت کیے کے پلے۔ ”بچہ! ایشور کے لئے مجھے چھوڑ

دو برس بعد میں سے اب۔ والدینہ آؤں۔ میں کہا جاتا تھا کہ تم اس نیت سے  
 بوڑنگہ ہاؤس جاؤ۔  
 کمالہ۔ بخدا میں بالکل اچھا ہوں۔ اب کاشمیر بالکل غلط ہے۔ میں اب غیر تندرست ہوں  
 تو آج اب اس کے لئے۔ اور اب آپ خواہ مخواہ کا کمر صاف کرنا چاہتے ہیں  
 منشی جی رکھ کر کہہ کر۔ کڑا مدد کرنا چاہتا ہے کہ  
 کمالہ جی اندر سے ایک خط لکھا تھا۔ اُس کا جواب لکھ رہا تھا۔  
 منشی جی اور یہ کہ تو وغیرہ کیوں ارادے۔  
 کمالہ۔ اسی لئے کہ خوب اطمینان سے پڑھیں۔ انہیں خرافاتوں میں بہا کر دیا گیا  
 ہو جاتا تھا۔ آج میں نے اُن کا خاتمہ کر دیا۔ اب آپ دیکھ کر کہہ سکتے ہیں  
 کہ ابھی لگتا ہوں۔  
 بابر نے ڈپٹی صاحب کے ہوش بجا ہوئے۔ اندر آکر پڑھتی تھی۔ حال تو بچھا  
 تو اُس نے صدی دہائی کہہ سنانی۔ انہوں نے جب سُن کر رجز سے غف میں  
 آکر کمالہ کے کنکڑے پھاڑ ڈالے اور چخیاں توڑ ڈالیں تو بابر نے ہار منسہ پڑھ کر  
 اور کمالہ کی دلچسپیوں کی خاندان بریادی کا راز سمجھ میں آ گیا۔ اب اس کے لئے معلوم  
 ہوتا ہے کہ یہ ہوں ان لالہ کو درست کر کے چھوڑ دیں گی۔ آج کل دفتر سے اس کے لئے  
 گھری پر بیٹھے پاتا ہوں کبھی کبھی کتاب جو کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے لئے  
 بیوی کے سپرد میں۔ دیکھ لینا اب سنبھل جائیے۔



## بدگمانی

مردج رانی کی رخصتی کے بعد میاں کا گھر ایسا سُونا ہو گیا۔ گویا نفس سے چڑیا اڑ گئی وہ اُس گھر کا اُجالا اور اس جسم کی جان بھٹی۔ مکان وہی ہے مگر درود و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی ہے مکین ہی ہیں مگر سب کے چہرے افسردہ اور آنکھیں غمناک ہو رہی ہیں گلشن وہی ہے مگر خزاں رسیدہ۔ رخصتی کے بعد ہمینہ بھر کے اندیشی سمیوں لال بھی تیرتھ جاتا رہا کو سدھائے مال دولت جو کچھ تھا پرتاپ کو سو نہ پایا۔ اپنے ساتھ مرگ چھالہ۔ بھگوت گیتا اور چند کتابوں کے سوا اور کچھ نہ لے گئے۔

پرتاپ چند پُر زور محسوسات کا نو جوان تھا مگر اس کے ساتھ ہی ضبط کی انتہائی قوت بھی اُسے حاصل تھی۔ مکان کی ایک ایک چیز اُسے برجن کی یاد دلاتی رہتی۔ یہ خیال دل سے ایک لمحہ کیلئے بھی دُرنہ ہوتا کہ کاش برجن میری ہوتی تو کیسے اُلفت سے زندگی بسر ہوتی، مگر اس خیال کو وہ دُور کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کھلی رہتی اور خیال کہیں اور جا پہنچتا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو برجن کی صورت آنکھوں میں پھر لے لگتی۔ جذبہ محبت کو ضبط کی طاقت سے دباتے دباتے یہ حال ہو گیا گویا برسوں کا مریض ہے۔ عشاق کو اپنی تماثل کے پوری ہونے کی امید ہو یا نہ ہو مگر وہ دل ہی دل میں اپنے معشوق کے دیدار کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ عالم خیال میں معشوق سے باتیں کرتے ہیں۔ جھپڑتے ہیں۔ دُوبٹتے ہیں۔ جھٹاتے ہیں۔ ان تصورات سے انہیں تسکین ہوتی۔

ہے اور دل کو ایک پُرمرہ اور خوشگوار مشغل ہاتھ آ جاتا ہے۔ مگر کاش کوئی طاقت انہیں اس گلشن خیال کی سیر کرنے سے روکے۔ کاش کوئی طاقت انہیں خیل میں بھی تصویر یار کا دیدار نہ کرنے دے تو ان بد قسمت بندگانِ محبت کی کیا گت ہوگی۔ پرتاپ انہیں بد قسمت شخصوں میں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ چاہتا تو مسرت بخش خیالات و لطافت اٹھا سکتا تھا۔ عالم خیال کی سیر ظاہری دلچسپیوں سے کم لطافت انگیز نہیں ہوتی مگر مشکل تو یہ تھی کہ ویرجن کے خیال کو بھی عاشقانہ جذبات کی آلائش سے پاک کھنچا جاتا تھا۔ اسکی تربیت ایسے پاکیزہ اصولوں پر ہوئی تھی اور اسے ایک نیک من پاک باطن بزرگ کی صحبت سے فیض اٹھانے کے ایسے اچھے موقع ملے تھے کہ اسکی نگاہوں میں خیالات کی پاکیزگی کی اتنی ہی وقعت تھی جتنی فعلوں کی پاکیزگی کی۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ویرجن کو جسے بار بار باہن کہہ چکا تھا۔ جسے اب بھی بہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ عالمِ حوال میں بھی ایسے تصورات اور جذبات کا مرکز بنانا جو خجاست سے کیسے ہی پاک ہوں مگر نفس سرکش کی حوصلہ افزائیوں سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے جیتک مغنی بیچون لال میچور تھے اس کا کچھ نہ کچھ وقت ان کے ساتھ گیا ان کا وہ معرفت بے چرچوں میں کٹ جاتا تھا جس سے روح کو کوہِ تشفی ہوتی تھی۔ مگر ان کے چلے جانے کے بعد تربیت نفس کے یہ موقع بھی جاتے رہے۔

سچنا اسے ہر دہائی کے فتنہ پائی تو اسے بہت مہرہ ہوتا۔ ایک روز اس نے کہا کہ تمہاری طبیعت یہاں نہ لگتی ہو تو کچھ دن کے لئے الہ آباد چلے جاؤ۔ ہاں شاید تمہاری طبیعت بحال ہو جائے۔ یہ خیال پرتاپ کے دل میں کسی بار پیدا ہوا تھا مگر اس وقت سے کہ اتنا کہ تمہاری بہت مشاق گزری تھی اس نے کبھی تجویز پر

غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف سے اشارہ پایا تو مادہ پختہ ہو گیا۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانگی کا دن مقرر ہو گیا۔ اب سب اُمکا کا یہ حال ہے کہ جب تک پرتاپ کو پردیس میں رہنے دینے کے متعلق بدلائقن کہہ رہی ہے۔ بیٹا دیکھو کسی سے راز دست مول لینا جھگڑ کی تو تہااری ویسے بھی عادت نہیں ہے مگر سمجھا دیتی ہوں۔ پردیس کا واسطہ ہے بھونک بھونک کہ قدم کھنا کھنا کھانے پینے میں بے احتیاطی نہ کرنا۔ تمہاری یہ بڑی بڑی عادت ہے کہ حائل میں سرشام سے سو جلتے ہو۔ پھر کوئی کھانے کے لئے کتا ہی جگلاتے سکتے تک نہیں۔ آپ بھی اُپاس کہتے ہو دوسروں کو بھی اُپاس کراتے ہو۔ یہ عادت پردیس میں بنی رہی تو تمہیں رات کا کھانا کا ہیکہ بیٹے ہوگا۔ دن کو ذرا دیر کے لئے آرام کر لیا کرنا تمہاری آنکھوں میں نون کو جیسے نیند سی نہیں رہتی۔ اسے جب موقع ملتا بیٹے کو ایسی ہی مادرانہ نصیحتیں کیا کرتی۔

آخر روانگی کا دن آپہنچا گاڑی اس بجے دن کو چھوٹی تھی پرتاپ نے سو جا رہی سے ملاقات کر لوں۔ پردیس جا رہا ہوں۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ دل نے گد گدایا۔ ماں سے کہہ بیٹھا۔ سب اُمکا بہت خوش ہوئی ایک طشت میں حلوا اور سوسے اور تین قسم کے مربے لے رکھ کر دھبیا کو دے دیے کہ لٹو کے ساتھ چلا۔ پرتاپ نے خط صاف کیا۔ کہنے سے بے ادب بن سزا کر چلے مگر چلے کو تو چلے۔ اب جوں جوں قدم آگے اٹھتا ہے دل بیٹھا جاتا ہے طرح طرح کے خیالات آ رہے ہیں۔ بچانے من میں کیا سمجھ گیا ہے مجھے جا رہا چلے گزر گئے۔ اُس نے مجھے ایک خط بھی تو الگ نہیں لکھا۔ پھر کہہ کر کہوں کہ میرے ملنے سے اسے خوشی ہوگی! جی اب اسے تمہاری فکر ہی کیا ہے۔ تم مر بھی جاؤ تو اسے خبر نہ پہنچے یہاں کی بات اور جی دہاں کی بات اورو ہے۔ او مجھے یہ کیا حماقت



برجن۔ کب جائیں گے؟  
 ردھیا۔ آج دس بجے کے بیٹم سے جو یا ہیں مہم سے بھینٹ کرن آؤت رہے توں  
 دوا پر آئے کے لوٹ گئے۔

برجن۔ یہاں تک آ کے لوٹ گئے۔ دوا زہ پر کوئی تھا یا نہیں؟  
 ردھیا۔ دوا پر کہاں آئے۔ سڑک پر سے چلے گئے۔

برجن۔ کچھ کہا نہیں کیوں لوٹا جاتا ہوں  
 ردھیا۔ کچھ نہیں آتا بولے کہ ہمارے چھوٹ جیسے توں ہم جانتا ہے۔

برج رانی نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ پریوٹی کے پاس  
 جا کر بولی :- اماں ! لٹو آج الہ آباد جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ذرا ان سے ملتی آؤں  
 پھر نہ جانے کب ملنا ہو کہیں ہو۔ مہری کہتی ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ مگر وہ  
 سڑک کے اسی پار سے لوٹ گئے۔

پریوٹی۔ ابھی نہ بال گندھوا نے نہ مانگ بھروائی نہ پٹری بنے اور چلنے کو تیار  
 ہو گئیں

برجن میری اتال جی آج جانے دیجئے۔ بال وال گندھوا۔ نہ بیٹھیں تو دس  
 یہیں بچ جائیں گے۔

پریوٹی۔ اچھا تو جاؤ۔ مگر شام تک لوٹ آنا۔ گاڑی تیار کرالو۔ میری طرف سے  
 سناٹا کو پالا لگن کہہ دینا۔ برجن لپکی ہوئی کمرہ میں آئی، کپڑے بدلے۔ مادھوی کو  
 باہر دڑایا کہ گاڑی تیار کر لے کے لئے کہہ آ۔ تب تک کچھ خیال آیا۔ ردھیا سے  
 پوچھا۔ "کچھ چھٹی پتر نہیں دیا۔"

ردھیا نے پرندہ نکال کر دیدیا۔ بوجن نے اسے بڑے شوق سے لیا مگر اسے  
پڑھتے ہی اُس کا چہرہ کلا گیا۔ سوچنے لگی کسہ دوا ذہ تک آکر کیل لٹ گئے اور  
خف بھی اٹھا تو ایسا اگھڑا۔ مہمل چرخوش! ہم سے عجلت کے باءٹ مل سکے۔  
ایسی کیا عجلت تھی۔ کیا گاڑی کے نوکر تھے۔ دن بھر میں کچھ نہیں تو پانچ چھ  
گاڑیاں جاتی ہونگی کیا مجھ سے ملنے کے لئے اُن سے دو گھنٹہ کی دیر بھی برداشت  
نہ ہو سکی۔ ضرور اس میں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ مجھ سے کوئی خطا ہوئی۔ یکا یک اسے اس  
وقت کی یاد آئی جب وہ عالم بقیاری میں پرتاپ کے پاس گئی تھی اور اُس کی  
زبان سے نکلا تھا: ”لو مجھ سے صبر کیسے ہوگا۔“ بوجن کو اب سے پہلے کئی  
بار خیال ایسا تھا کہ میرا اس وقت کا اور اس حالت میں جانا بہت ہی نامناسب  
تھا۔ اس وقت یقین ہو گیا کہ میں ضرور للو کی نگاہوں میں گر گئی۔ میری محبت  
اور عزت اب اُن کے دل میں نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر بیٹھ گئی۔  
اور مادھوی سے بولی: ”کوچیان سے کہہ دے گاڑی نہ تیار کرے میں جاؤنگی“

## رض اور محبت کی کشمکش

وقت تک برج رانی مسلسل نہ آئی تھی۔ اسکی نگاہوں میں ایک منہ پتی برتا محبت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی اعلیٰ معیار نہ قائم ہوا تھا۔ گھر میں کبھی اُس کے شوہر کا ذکر نہ آتا یا اگر آتا تو ناخوشگوار طریقے پر۔ اُس نے استری دھرم کی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر ان کا کوئی دیرپا اثر اُس پر نہ ہوا تھا غالباً اُسے یہ خیال ہی نہ آتا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے اور مجھے بہت جلد یہاں سے جانا پڑے گا۔

مگر جب وہ مسلسل میں آئی اور اپنے دل و جان کے مالک بننے لگی تو شوہر نہ ہر دم آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی تو رفتہ رفتہ اُس کے دل کی کیفیت متغیر ہونا شروع ہوئی۔ روشن ہٹاکہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میرا کیا دھرم ہے اور مجھے کس طرح اپنا دھرم نبھانا چاہیئے۔ اگلی باتیں خواب ہی معلوم ہونے لگیں۔ ہاں جس وقت یاد آ جاتا کہ کم از کم ایک خطا مجھ سے ایسی ہوتی ہے جسکی میں تلافی نہیں کر سکتی تو وہ خود بخود شرم سے سرخ ہو جاتی اور اپنے تئیں کوئی اسے تعجب ہوتا کہ لگو کے سامنے جلنے کی مجھے کیونکر جرأت ہوئی۔ شاید اُس واقعہ کو خواب سمجھنے کی کوشش کرنی۔ تب لگو کی شریفانہ صورت اُس کے پیش نظر ہوجاتی اور وہ صدق دل سے اُسے عادی۔ روز بروز اُس کی محبت اور عزت دل میں زیادہ

ہوتی جاتی تھی۔

لیکن آج جب پرتاپ چند کی تلون مزاجی سے اُسے یہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ لقا اس اقدار کا بھی بھولا نہیں ہے اس کی نگاہوں میں میری وقعت نہیں رہی۔ یہاں تک کہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے تو اسے حسرتناک غصہ پیدا ہوا۔ پرتاپ کی طرف سے طبیعت کھلے ہو گئی اور اُس کی جو محبت اور عودت دل میں تھی وہ دمِ زدن میں پانی کے بخارات کی طرح غائب ہوئے اُلٹی۔ عورتیں بہتہ درجہ کی ذکی الحس ہوتی ہیں۔ وہ جتنی پُر دلی اور مکیوں کی محبت کر سکتی ہیں اتنی ہی سرگرمی سے نفرت بھی کر سکتی ہیں جس پرتاپ کے لئے وہ اپنی ہستی خاک میں ملا دینے کو تیار تھی۔ ..... وہ اُس کے ایک طفلانہ فعل کو بھی رگڑ نہیں کر سکتا کیا اس کا دل ایسا تنگ ہے! یہ خیال برجن کے پہلے دل میں گنا کی طرح کھٹکنے لگا۔

آج سے برجن کی زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ سوچیں کہ جب پرتاپ مجھے مَحْبُول گئے اور میری رتی بھر بھی عزت نہیں کرتے تو اس صدمہ سے میں کیوں اپنی جان کو پھاؤں۔ جیسے رام تلسی سے ویسے تلسی رام سے اگر انہیں مجھ سے نفرت ہے، اگر وہ میری صورت سے بیزار ہیں تو میں بھی اُن کی صورت سے متنفذ ہوں اور مجھے بھی اُن سے ملنے کی خواہش نہیں۔ تب وہ اپنے ہی ماہرہ جھنجھلا اٹھتی کہ میں ہر دم انہیں کی باتیں کیوں سوچا کرتی ہوں اور ادا دادہ کرتی۔ کہ اِس اُن کا خیال بھی دل میں نہ آئے تو کئی گھر دریا میں خیال پھر اسی طوط جاپہنچا اور وہی خیالات بے چین کر کے لگے۔ قلبی اور خیالی انتقام کے جوش میں وہ کلامِ طوط سے خلوص محبت کا اظہار کر لے اُلٹی۔ وہ ذرا دیر کے لئے کہیں چلا جاتا تو اُس سے



شکایت کرتی جتنے نقد و پے جمع کر کھے تھے وہ سب اسے دیدیئے کہ اپنے لئے  
 سونے کی لکڑی اور طلائی چین خریدے۔ کملہ نے ذرا انکار کیا تو ابیدہ ہو گئی۔ وہ  
 یوں ہی اُس کا غلام بنا ہوا تھا۔ اُس کی محنت کا پیرنگ نہ کھکرا دے بھی جہاں دیئے لگا۔  
 دوستوں نے سنا تو مہارکبا دیں دینے لگے جہاں حمید اور سعید اپنی اپنی قسمتوں کو کھنے  
 لگے۔ کمالیسی جیتی بیوی ہم کو نہ ملی۔ تمہیں وہ بنا مانگے ہی مل سرفور کرتی ہیں اور یہاں  
 بیویوں کی فریادیں کئے ملنے ناک میں دم ہے۔ چاہے اپنے پاس کافی کوڑی ہندو مگر  
 اُن کی فرمائشیں ضرور پوری ہوتی چاہیں ورنہ طوفانِ نوح برپا ہو جائے گا اسی ہور کیا  
 کہیں کبھی گھر میں ایک بیڑے پلان کے لئے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بے دس پاچ الٹی  
 سیڑھی سے نصیب نہیں ہوتا۔ خدا ہم کو بھی تمہاری بیوی عطا کرے۔

یہ سب تھا۔ کملہ چرن بھی محبت کرتا تھا اور برج رانی بھی محبت کرتی تھی مگر  
 دونوں کے ملنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے برجن کے چہرہ پر اس کا مطلق نشان  
 نہ تھا۔ روز بروز اندھا اور بحیفہ ہوتی جاتی تھی۔ کملہ چرن تمہیں دے دیکر پوچھتا کہ تم  
 دہلی کیوں ہوئی جاتی ہو۔ اُسے غم میں رکھنے کی جو تدبیریں بن پڑیں تیار دو ستوں سے  
 بھی اس اسم معاملہ میں مشورہ لیتا مگر کچھ کا رگز نہ ہوتا تھا۔ برج رانی ہنس کر کہہ  
 دیا کرتی کہ تم کچھ فکر مت کرو۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ کہتے کہتے اٹھکرا سکے بالوں  
 میں کنگھی کر لے لگتی یا پیکھا جھیلنے لگتی۔ ان خاطر دایلیں سے کملہ چرن پر ہنوں  
 کا سُورہ ہو جاتا۔ مگر لکڑی کے اُپر رنگہ روغن لگانے سے وہ کیرا نہیں کرتا جو  
 اندر بیٹھا ہوا اُسکا طبع کھائے جاتا ہے۔ یہ خیال کہ نہ پتا پ چند مجھے بھل گئے او  
 میں اُکی نظروں میں کر گئی۔ ناسور کی طرح اُسکے طبع میں چھید کیا کرتا تھا۔ اُسکی

حالتِ زبردِ روزِ خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سبتر پے اُغنا شکل ہو گیا واکرڈ  
کا علاج ہونے لگا۔

ادھر پرتاپ چند کی طبیعتِ الہ آباد میں منجھل چلی تھی۔ ورنش کا قول ہے  
شوق تھا ہی وہاں اس کا خوب چرچا تھا۔ غم غلط کرنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا  
فل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے جسمانی محنت سے بڑھ کر اور کوئی علاج نہیں ہے۔  
صبح کو جتنا سبک اند کشتی شام کو کرکٹ اور فٹ بال۔ ۲۰ گھنٹہ بچے مات تک  
باغیچوں کی سیر اتنی محنت کے بعد چار پانی پر گریا تو سویرے آنکھ کھلتی چھ پتلی  
میں کرکٹ اور فٹ بال کا کیتان بن بیٹھا اور دو تین میچ ایسے معرکے کے کیلئے کہ  
سارے شہر میں مھوم مچ گئی۔

کچ علی گڑھ کی ایک زبردست ٹیم سے ان کا کرکٹ میں مقابلہ تھا۔ بیٹیم  
ہندوستان کو مشہور ٹیموں کو شکست دیتی۔ فتح کا ڈنکا بجاتی ہوئی یہاں پہنچی  
تھی۔ انہیں غالباً اپنی فتح کی جانے بہت اندیشہ تھا۔ وہ کئی مضبوط  
ٹیموں سے پالا مار چکے تھے مگر اس کے ساتھ ہی الہ آباد والے پلوں نے نظر آنے لگے۔  
انہی امیدیں پرتاپ چند سے دلچسپی تھیں لہذا آدھ گھنٹہ بھی جم گیا توڑوں  
کے انار لگا دیا اور اگر اتنی ہی دیر تک گیند چل گیا تو پھر اُدھر کا دارا نیا لاج  
پرتاپ کو بھی اتنا برا میچ کھیلنے کا اتفاق نہ تھا۔ کلیجہ بالسنل اُچھل رہا تھا  
کہ جانے کیا نتیجہ ہو۔ دس بجے کھیل شروع ہوا۔ پہلے علی گڑھ والوں کے  
کھیلنے کی باری تھی اور دو ڈھائی گھنٹہ تک انہوں نے خوب جوہر دکھائے۔  
ایک بجتے بجتے کھیل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ علی گڑھ نے ۴۰۰ رن کئے۔

اب الہ آباد والوں کی باری آئی۔ مگر کھلادیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے یقین ہو گیا کہ بس طرح با۔ ہے۔ اب عہدہ برآ ہونا محال ہے۔ اتنے دن کن کو لگا لکھنے پر تپا کیا بنا لیا۔ پہلا کھلادی آیا اور تیسرے گیند میں رخصت ہو کر آیا اور مشکل سے پانچ گیند کھیل سکا۔ تیسرا آیا اور پہلے ہی گیند میں کیچ ہو گیا چوتھے نے اگر دو تین معرکے کے مہٹ لگائے مگر حجم نہ سکا۔ پانچویں صاحب ہلاک کر نہیں شہر کا کالج تھے مگر یہاں اٹلی بھی کچھ نہ چلی۔ بھائی دیکھتے ہی تپا ہو گئے۔ اب تپا پ چند مسرت سے قدم اٹھانا۔ بیٹا گھٹا میدان میں آیا۔ طرفین نے تالیاں بجا دیں۔ الہ آبادیوں کی کیفیت یہاں میں نہیں آ سکتی۔ ہر شخص کی نگاہیں پر تپا چنکی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ چوتھے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ دور بیٹھ ہوئے خدا سے دعا کر رہے تھے کہ تپا پ سرخو لو لے۔ دیوی اور دیوتا یاد رکھتے جا رہے تھے۔ پہلا گیند آیا۔ تپا پ نے خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل اسی پھر بیٹھ گئے۔ دوسرا گیند آیا وہ بھی خالی گیا۔ الہ آبادیوں کے دل ناٹ تاک پہنچ گئے۔ بہت سے آدمی پھرتی سنبھال گھر کی طرف چلے۔ تیسرا گیند آیا۔ ایک پٹانے کی آواز ہوئی اور گیند شہاب ثاقب کی طرح آسمان کی چتر چھوڑ کر پڑے ہوئے والے فیلڈ سے صبر گز کے فاصلے پر گرا۔ الہ آبادیوں نے تالیاں بجا دیں۔ سو کھے خان میں پانی پڑا۔ جانیالے ٹھک گئے۔ مایوسوں نے پیٹھ پیٹھی کی۔ دوسرا گیند آیا اور پہلے والے گیند سے دس گز کے گرا۔ فیلڈر چمکے مہٹ پر کلک پہنچائی۔ پانچواں گیند آیا اور کٹ پر گیا اتنے میں اور وہ ہوا بولر بدلے۔ سینے بولر پورے قاتل تھے۔ مہلاک گیند پھینکتے تھے۔ مگر ان کے

پہلے ہی گیند کو تپا پئے سوچ سے بات کرنے کے لئے اسٹان کی طرف مجھ پر باپھر تو  
گیند ادا اسکی تھپائی میں سازش سی ہو گئی۔ گیند آتا اور تھپائی سے بغلیں ہو کر کبھی پوسٹ  
کی راہ لیتا کبھی پچھ کی، کبھی اتر کی کبھی دھن کی۔ فیلڈروں کا دھڑلے دوڑتے ٹاک میں  
دم تھا۔ لہذا بادوا لے کر چھلتے تھے۔ بغلیں بجاتے تھے۔ لوہیوں ہوا میں اچھل رہی تھیں۔  
ایک صاحب نے روپے نکال کر اٹھوائے۔ دوسرے صاحب نے اپنی سنہری زنجیر نکال دی۔  
حرلیف دل میں جلتے۔ جھنجھلاتے۔ کبھی میدان کی ترتیب بدلتے۔ کبھی بولر تبدیل کرتے  
مگر سب تدبیریں ادا چالیس بے اثر مہدی تھیں۔ گیند کا تھپائی سے یا لانا نہ ہو گیا تھا۔

کامل دو گھنٹوں تک پتا پتا پٹا خاواں بگڑے اور ہوائیاں چھوٹے آ رہی اور  
فیلڈ گیند کی طرف دل لپکتے چلے۔ پچھو اور کی طرف لپکتے ہیں۔ رنوں کی تعداد تین سو  
تک پہنچ گئی۔ حرلیفوں کے چھلے چھوٹے۔ ایسے حواس باختہ ہو رہے تھے کہ ایک گیند  
جی سیدھا کرتا تھا فیلڈ میں بے نتیجی پھیلی ہوئی تھی یہاں تک کہ ریتا پنے پچاس رن  
اور کئے اور اب اس نے یہاں سے دو آدم لیتے کی مہلت مانگی۔ اُسے آتے دیکھ کر  
ہناٹا ہڈی اسکی طرف لپکا اور اسے یاری بانی سے قدمیں اٹھانے لگے۔ چاند نظر  
جھک کر گئی بیسکروں چھ آتے۔ چھتریاں۔ ٹوپیاں اور جوئے عالم بالکل سیر کرنے لگے۔  
گویا وہ بھی فرط مستی سے اچھلے پڑتے تھے۔ عین اس وقت کہ ارکھر کا چیرا سی بائیسکل  
پر آتا تھا دکھائی دیا۔ قریب آکر بولا: "پر تپا چند کس کا نام ہے؟" پر تپا نے چوک  
کر اسکی طرف دیکھا اور چڑی نے تاکا لقاؤ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ پر تپا ہی پر تپا  
کا چہرہ نند ہو گیا۔ ٹھنڈی سانس لیکر کسی پر تپا گیا اور بولا "یاد اب مرغ کا فیصلہ  
تمہا ہے ہاتھ ہے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اسی ڈاک سے وہاں چلا جاؤ گا۔"

ریکٹر ڈیوڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔ سیکڑوں آدمی پوچھنے لگے کیلہ ہے کیلہ ہے؟  
لوگوں کے چہرہ پر مرنی چھا گئی مگر اُسے بات کرنے کی کہاں فرصت۔ ایسوقت ٹرین پر  
بیٹھا اہل ہند اس کی طرف روانہ ہو گیا۔

ماستہ بھڑکس کا دل تشویشوں کی جلا ننگہ بنا رہا۔ بار بار اپنے کو غمزہ کرتا کہ  
میں نے چلتے وقت کیوں اُس سے مل لیا۔ اپنے جانے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اگر خدا نخواستہ  
اُسکی مصدقہ بیکینی نصیب نہ ہوتی تو میں بھی مٹنے میں کالہ لگا کر کہیں مر رہ ہوتا۔ یہی  
بائیں سوچ کر کئی بار دیا۔ تو مجھے شب کو گھڑی بنا کر پہنچی اُس پر سے اترتے ہی سیدھا  
شیا پوچرن کے مکان کی طرف چلا۔ فرط غلامی سے آنکھیں دھڑبھانی ہوئی، تختیں اٹھ کھڑے  
دھڑک رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب کرسی پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے اور کھلا ڈاکٹر صاحب  
کے یہاں چلنے کو تیار کھڑا تھا۔ پرتاپ چٹکھو دیکھتے ہی دھڑک کر لیٹ گیا۔ شیا پوچرن  
نے ہی کئے لگا یا اور پوچرن نے۔ کیلہ بھی سیدھے الہ آباد سے چلے آ رہے ہو؟  
پرتاپ جی ہاں آج اس کی تاریخ پوچھا کہ راجن کی حالت بہت خراب ہے کیا  
ابھی وہی حالت ہے؟

نیا پوچرن کیا کہیں۔ ادھر دو تین حملہ سے روز بروز کمزوری ہوتی جاتی ہے۔  
دواؤں کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ دیکھیں ایشور کو کیا متلو رہے۔ ٹاکٹر  
صاحب تو کہتے تھے تپ ق ہے مگر حکیم صاحب ضعف جگر بتلاتے ہیں۔  
راجن کو جو تپ جبری کہ پرتاپ چندے ہوئے ہیں تپ سے اس کے دل میں امید  
اور بیم کی گھڑ دو ٹپ ہوئی یعنی کبھی سوچتی کہ گھر آئے ہونگے مچھی نے زبردستی ٹھیل ٹھاکر  
یہاں بے چارہ ہو گا۔ پھر خیال ہوتا شاید میری بیماری کی خبر پائی ہو۔ گھر راکر چلے آئے

ہوں مگر نہیں یا نہیں میری ایسی کیا فکر پڑی ہے۔ سوچا ہوا کہ میں مر نہ جائے۔ لاؤ  
جلد دنیا کا پرتاؤ تو کرتا آدمی۔ انہیں میرے مرنے چیلنے کا کیا غم۔ آج میں بھی حضرت  
سنے جی کھول کر باتیں کر دوں گی۔ لیکن نہیں۔ باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انہوں نے  
چُپ سا دھکی ہے تو میں کہوں بلبل۔ بس اتنا کہہ دوں گی کہ بہت اچھی طرح ہوں اور  
تمہاری خیریت کی دعا کرتی رہتی ہوں پھر زبان نہ کھولوں گی۔ اور میں یہ مسکاتی چلی ساری  
پچھنے کیل بھیجی ہوں جو اپنا ہمدرد نمروائس کے آگے یہ صورت بنائے رکھنے سے  
فائدہ۔ وہ مہمان کی طرح آئے ہیں میں بھی مہمان کی طرح اس سے پیٹھ اٹوکی۔ اور ان  
کا دل کیسے بچیدار ہے! جس شخص کی سرد مہر کے خیال نے یہ جرح کی یہ گت بنا رکھی  
تھی اسی شخص خجلانے کے لیے ایسے منصوبے باندھ رہی ہے۔

دس بجے کا وقت تھا۔ مادھوی میٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ وہ اول کی شیشیاں  
ادھر ادھر مڑی ہوئی تھیں اور برج چار پانی پڑ پڑی ہوئی سب باتیں سوچ رہی تھی کہ پرتاپ  
کمرہ میں داخل ہوا مادھوی چونک کر بولی۔ بہن! اُٹھو۔ آگے۔ برج چار ہبک بکھرا کھئی۔  
اور چار پانی سے اترنا چاہتی تھی، ضعف کے واسطے زمین پر گر پڑی۔ پرتاپ نے  
لے آئے سنبھالا اور چار پانی پڑ پڑا دیا۔ آہ! یہ وہی برج ہے جو آج سے چند ماہ قبل حسن  
اور شاپ کی مورت تھی جس کے کھڑے پر جب ادا نکھوں میں منہسی کا بسیرا رہتا  
تھا جس کا بولنا شیا ما کا گانا اور نہنا من کا گانا تھا۔ وہی ریلی آنکھوں والی  
میٹھی باتوں والی برج اب ایک تودہ استخوان ہو گئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔ پرتاپ  
کی آنکھوں میں آنسو بھرائے۔ مزاح کی کیفیت پوچھنا جاتا تھا مگر منہ صرف  
اتنا بولا۔ "بہرِ برج" ادا آنکھوں سے اشک کے قطرے ٹپکنے لگے۔

محبت کی آنکھیں جذبات کے پرکھنی کسوٹی ہیں۔ برجن نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور ان چند قطرے اُٹسک نے اُس کے دل کا سب بخار دھو دیا۔

جیسے کسی فصیح کا سپہ سالار جو اُسے دلی لڑائی کا نقشہ دل میں سوچ رہا ہو غنیمت کو اپنی نشت پر دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے اور مجوزہ نقشہ کا خیال بھی اُسے نہیں رہتا۔ اُسی طرح برجن پر تاپ چند کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب باتیں بھول گئی جو وہ ابھی بڑی بڑی سوچ رہی تھی وہ پر تاپ کو روکے دیکھ کر اپنا سب کچھ بھول گئی اور چار پانی سے اُٹھ کر آبل سے اُس کے آسنو پونچھنے لگی۔ پر تاپ جیسے خلا دار کہہ سکتے ہیں اس وقت مظلوم کی حیثیت میں تھا اور برجن جس نے اپنے تئیں گھلا گھلا کر اس حالت کو پہنچا دیا تھا دعوہ کر اس سے کہہ ہی تھی۔ اللہ چپ رہو۔ ایسا نہ جانتا ہے میں بالکل اچھی ہوں گویا اچھا نہ ہونا اُس کی خطا تھی۔ عورتوں کے احساسات کیسے نازک ہوتے ہیں۔ پر تاپ کی ایک ذرا سی سہل انگاری نے برجن کو اس زندگی سے لاپرواہ بنا دیا تھا۔ اور آج اُس کی چند بندوں نے اس کے دل کی وہ جلیں وہ سوز وہ آگ بچھا دی جو کئی مہینوں سے اُس کے غول اور جگر کو جلا رہی تھی

جوہر من بڑے بڑے حکیمان اور اکثروں کے علاج سے تھک رہا اُسے آسنو کے چند قطرے نے دم دھن میں دھو کر دیا کیا یہ پانی کسے طرح امرت کی بوندیں تھیں؟

پر تاپ نے ضبط کر کے پوچھا۔ ”برجن! یہ تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے؟“

برجن۔ ”مسکرا کر یہ گت میں نے نہیں بنائی۔ تم نے بنائی ہے۔“

پر تاپ۔ ”اباں کا تار نہ پہنچتا تو مجھ اطلاع بھی نہ ہوتی۔“

برجن۔ ”صورت کیا تھی۔ جسے کھلانے کے لئے الہ آباد چلے گئے۔ اس کے مرنے پہلے

کی جہد کیا پروا؟  
 پرتاپ۔ باتیں بنا ہی ہو۔ غیروں کو کیوں خط لکھتیں۔  
 برجن۔ کسے اُمید تھی کہ تم اتنی دُور سے آنے کی یا خط لکھنے کی زحمت اٹھاؤ گے جو  
 دھڑلے سے اکھڑ جائے اُدھوت دیکھنے تک ادا دار نہ ہوئے خط بھیجا کیا کرتی  
 پرتاپ۔ اُس وقت لوٹ جانے کا جتنا مدد مجھے ہوا میرا دل ہی جانتا ہے، تلے ہے  
 دتھک میرے پاس کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ میں سمجھا اب یاؤں سے جاتی ہوں،  
 برجن۔ اگر میں ہتھاری باتوں پر اعتبار کر لیگی علوی نہ مروتی تو اس وقت کہہ دیتی۔ یہ سب  
 سوچی مروتی باتیں ہیں۔

پرتاپ۔ خیر حبیبہ! سمجھو۔ اب بربتاؤ کہ طبیعت کی کیا کینیت ہے میں نے تمہیں  
 پہچانا نہیں۔۔۔ مہا چہرہ اُتر گیا ہے۔  
 برجن۔ اب اچھی ہو جاؤنگی۔ دوا مل گئی۔

پرتاپ۔ کتنا یہ سمجھ گیا۔ افسوس، امیری ذرا اسی غلطی نے یہ قیامت ڈھادی، دیر  
 تک اُسے سمجھا تا رہا اور علی الصباح جب وہ اپنے گھر چلا تو برجن کا چہرہ کھلا ہوا تھا  
 اسے یقین ہو گیا کہ لٹو مجھے بھولے نہیں ہیں، پوچھنا یاد اور عزت اُن کے دل میں قائم  
 ہے۔ پرتاپ نے اُس کے ہاتھ سے وہ کانٹا نکال دیا جو کئی مہینوں سے کھٹک رہا تھا اور  
 جس نے اُسکی یہ حالت کر دی تھی، ایک ہی ہفتہ میں اُس کا گھر اکندن کی طرح دھکنے  
 لگا۔ گویا کبھی بھاری نہ تھی؟



## فرض کی جیت اور محبت کی ہار

مرضی جیت تک بیمار ہوتا ہے اسے خبر نہیں ہوتی کہ کون میری تیمارداری کر رہا ہے۔ کون میری عیادت کے لئے آتا ہے وہ اپنی ہی تکلیفوں میں باسقد محو رہتا ہے کہ کسی دوسری بات کا خیال ہی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا مگر جب اسے محبت ہو جاتی ہے تو اپنے بیمار داندل کی توجہ اور پیشانی سرگرمی اور جھانپشانی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ بعد اُس کے دل میں ان کی محبت اور عزت زیادہ ہو جاتی ہے۔ یعنی یہی حاصل بدھ رانی کا تھا۔ جیت تک وہ خود آزار دل میں مبتلا تھی کمالاچرن کی حیرانیاں اور پیشانیوں کا اندازہ نہ لگا سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اسکی خاطر داری میں کوئی بات اٹھانہ رکھتی مگر یہ خاطر داریاں ایک فرضی انتقام کے خیال سے ہوتی تھیں نہ کہ سچی محبت سے لیکن جب اس کے جگر سے غم کا کاٹا نکل گیا تو کمالا کی دوا دوش اور سرگردانیاں یاد آئیں اور یہ فکر پیدا ہوئی کہ ان عنایات سے بیکراں کا جواب کیونکر دوں۔ میرا دم تھا کہ اپنی ذرا ت سے انہیں آرام پہنچاتی مگر آرام کا تو کیا ذکر میں تو اپنے اُنکی جان لے گا کہ ہوتی ہیں۔ وہ تو ایسے سچے دل سے میری محبت کریں اور میں اپنے مرض بھی نہ ادا کر سکوں۔ ایشور کی کیا عہدہ دکھاؤ گی سچی محبت کا کنول بسا افقات احسان کے اثر سے کھل جایا کرتا ہے۔ جہاں حسن شباب ملت چھا اور محاسن ذاتی محبت کا بیج بونے میں ناکام رہتے ہیں وہاں اکثر احسان کا جادو مل جاتا ہے۔ کھنی دل ایسا سخت اور سرد نہیں ہو سکتا جو سچی محبت

کے احسان سے بچھل نہ جائے۔

کمالاؤ برج رانی میں دوزیوں کا خلاص اور بیمار مجھنے لگا۔ ایک بندہ محبت  
 تھا اور دوسری کینئر فرمن ممکن نہ تھا کہ برج رانی کی زبان سے کوئی بات نکلے اور  
 چرن اسکی پلے کر لے کی دل و جان سے کوشش نہ کرے۔ اب اسکی محنت اور لیاقت  
 انہیں کوششوں میں صرف ہوتی تھی۔ پرمنا صرف والدین کو دھوکہ دینے کا ایک سلیہ تھا  
 وہ ہمیشہ اسکی طبیعت کا رنگ پکھتا رہتا اور اس امید پر کہ یہ کام اسکی خوشی کا باعث ہو  
 وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ ایک دن اس نے ماموہوی کو بھلوانی میں بھول چلتے دیکھا یہ  
 چھوٹا سا باغیچہ مکان کے پشت پر واقع تھا۔ مگر چونکہ کنیر کے کسی فرد کو اس سے دلی  
 ہمدردی نہ تھی۔ اس لئے بارہوں ہمیشہ اس پر خزاں کا دھڑ رہتا تھا۔ بسج رانی کو  
 چھوڑنے سے غلطی محبت تھی۔ چھوڑ رانی کی یہ رگت دیکھی تو ماموہوی کوٹا کید کی کہ کبھی کبھی  
 اس میں پانی دیدیا کرو۔ رفتہ رفتہ باغیچہ کی حالت کچھ کچھ سنجیدگی اور بعض پتوں  
 میں پھول نظر آنے لگے۔ کمالاچرن کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ دل و جان باغیچہ کے  
 سنوارنے پر لگ گیا۔ وہ ہوشیار بنی نوکر رکھ لئے۔ قسم قسم کے خوشگ پھول اور پودے  
 لگائے جانے لگے۔ انواع و اقسام کی گھاسیں اور پتیاں گھولوں میں سجائی جانے لگیں۔ جن  
 اور پتوں دوست ہونے لگیں۔ جا بجا تائیں چڑھا دی گئیں۔ کمالاچرن دن کے دن کتاب  
 ہاتھ میں لئے باغیچہ میں نہلتا رہتا۔ ماموہوی سے باغیچہ کی بناوٹ اور سجاول کی تاکید  
 کرتا رہتا۔ صرف اس لئے کہ برجی خوش ہوگی۔ ایسے بندہ رضا کا جلاو کس پر نہ چل  
 جائیگا۔ ایک روز کمالا نے کہا کہ آؤ تمہیں باغیچہ کی سیر کراؤں۔ برج رانی تیار ہو گئی۔  
 چاند نکل آیا تھا اور اسکی ندی کے شئی میں پھول اور پودے بہت سہانے معلوم

ہوتے تھے۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی اور موتیے اور پیلے کی بلٹیں دماغ کو معطر کئے دیتی تھیں۔  
 ایسے وقت میں برجمن ایک ملکی ریشمی ساڑی اور ایک نفیس محلی سلیپر پہنے۔ دوشوں میں پہلتی  
 نظر آئی۔ اُس کے چہرہ کی ملاحیت پچھلوں کو شرمندہ کر رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ پھول  
 کی دیوی ہے۔ مکلا چرن بولے۔ ”آج محضت سے بھل ہو گئی۔“  
 جیسے نقشے میں گل لال بھلا ہوتا ہے اُسی طرح برجمن کی ہر آنکھوں میں محبت کا  
 رس بھلا ہوتا تھا۔ وہ مسکراتی، مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔  
 مکلا۔ مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دُنیا میں نہ ہوگا۔  
 برجمن۔ کیا مجھ سے بھی زیادہ؟

مکلا حوالہ دہور ہا تھا۔ برجمن کو پیار سے گلے لگالیا۔

کچھ دنوں تک مردانہ یہی معمول رہا۔ اسی اثناء میں تازہ دلچسپیوں کے سامان  
 پیدا ہو گئے۔ رادھا چرن نے تصویروں کا ایک خوبصورت البم برجمن کے پاس بھیجا جس  
 میں کئی تصویریں چند لکھ موجود تھیں کہیں وہ بیٹھی شیا ما کو پڑھ رہی ہے۔ کہیں بیٹھی مٹی  
 خط لکھ رہی ہے۔ اس کی ایک تصویر مردانہ لباس میں بھی تھی۔ رادھا چرن نوٹو گرائو  
 کے فن سے بھی واقف تھے۔ برجمن نے یہ البم بہت پسند کیا۔ پھر کیا تھا۔ مکلا کو دھن سیار  
 ہوئی کہ میں بھی تصویر کشی میں جہارت حاصل کر دوں اور برجمن کی تصویر کھینچوں۔ بھائی کے  
 پاس لکھ بھیجا کہ کیرا اور دوسرے نچھوڑی سامان میرے پاس بھیج دیجئے اور مشق شروع  
 کر دی۔ گھر سے چلتے کہ مد سے جلا رہا ہوں اور بیچ میں ایک پارسی نوکر گرا فرکی دوکان پر  
 بیٹھتے۔ تین چار مہینہ کی محنت اور کوشش میں اس فن سے پوری واقف ہو گئی۔  
 مگر ابھی تک گھر پر کسی کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ کئی بار برجمن نے پوچھا بھی کہ سب کچھ دل

بھر کہاں غائب ہوتے ہو۔ تعطیل کے دن بھی نہیں نظر آتے ہو مگر کہاں چرن نے ہوں  
ہاں کمر کے ٹال دیا۔

ایک روز کمال چرن کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ برج کے جی میں آئی لٹو پر تپا  
چن کو ایک خط لکھ ڈالوں مگر صندوق کدو لا تو جھٹی کا کاغذ ملا۔ مادھوں سے کہا  
جا کر اپنے بھیلے کے دسک میں سے تھوڑا سا کاغذ نکال لا۔ مادھوی دوڑی ہوئی گئی  
تو اسے دسک پر تصویر والی البم کھلا ہوا ملا۔ اس نے البم اٹا لیا اور اندر آ کر برج  
سے بولی۔ ”بہن دیکھو یہ تصویر ملی۔“

برج نے اسے شوق سے ہاتھ میں لے لیا اور پہلا ہی ورق اٹا تھا کہ اچھا  
سا ہو گیا۔ وہ اسی کی تصویر تھی۔ وہ اپنی پلنگ پر چار داڑھے نیند میں مست  
ٹپڑی تھی۔ بال پیشانی پر بکھرے تھے تھے اور ایک ایک عضو سے بے تکلفی ٹپکتی تھی  
ہونٹوں پر ایک پلیر مسکراہٹ کا جلوہ تھا۔ گدیا کوئی دلپسند خواب لکھ رہی ہے۔ تصویر  
کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”خواب ناہ۔“ برج حیرت میں تھی کہ میری ایسی  
تصویر انہوں نے کیسے کھینچی اور کس سے کھینچی؟ کیا کسی فوٹو گرافر کو اللہ لئے ہنیکے  
نہیں ایسی شرارت بھلا لیا کریں گے۔ کیا تعجب ہے خود ہی سیکھ لیا ہو۔ ادھر مہینوں سے  
بہت مشغول بھی تو ہیں۔ اگر خود ایسی عمدہ تصویر کھینچی ہے تو واقعی قابل تعریف کام کیا  
ہے۔ وہ سرادق اٹا تو وہی اپنی ہی تصویر۔ ڈائیک ساڑی پہنے بے تکلفی سے آدھے سر  
بلک اچھل ڈالے سر چرن میں مصروف تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا ”سیر باغ“  
تیسرا ورق اٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر تھی۔ وہ باغیچہ میں زمین پر بیٹھی یا گوندہ علی ہے  
ڈھیروں پھل بادھ، ادھر بکھرے پٹے، ہیں ادھو دوڑ دوڑ پھول چن ہو رہے

یہ تصویر زمینوں سے زیادہ خوبصورت تھی کیونکہ مصور نے اس میں بڑی صفائی سے قدرتی رنگ بھر رکھے تھے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا: "البیسی مالن"۔ اب برجین کو خیال آیا کہ ایک روز جب میں ہارگوندھدی تھی تو کلاجرین نیل کانٹے کی ہمارے سے منسکراتے ہوئے نکلے تھے۔ ضرور اسی دن یہ تصویر کھینچی ہوگی جو تھامس آکٹاؤ ایک نہایت لطیف اور دلکش منظر دکھائی دیا۔ ایک اشفاق پانی کا پینٹہ تھا او اس کے دونوں کناروں پر جہاں تک نگاہ پہنچتی تھی۔ گلاب کے تختے نظر آتے تھے۔ ان کے نازک پھول ہوا کے جھونکوں سے لچکے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے سبز آسمان پر سرخ تارے ٹانک دئے ہیں۔ کیسی انگریزی تصویر کی نقل معلوم ہوتی تھی۔ الہم کے اور صفحا بھی سامنے تھے۔

برجین نے اپنی تصویریں دوبارہ دیکھیں اور اس نخت آئینہ مسرت کے ساتھ جو ہر پری پیکر گواپنے حق پر ہوتی ہے الہم کو چھپا کر دکھایا۔ شام کو کلاجرین نے آکر دیکھا تو تصویریں غائب تھیں۔ ہوش اڑ گئے۔ وہ اس کے کئی عہدین کی جگہ کاوی کا مرقہ تھیں اور اسے اُمید تھی کہ الہم تختے میں دیکر برجین کے دیدہ دل میں ابھی گھر کر لوں گا۔ بہت پریشان ہوا۔ اندھا کر برجین سے دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ یہ بچاؤ گھبراہٹا ہوا اپنے دوستوں کے گھر گیا کہ شاید انہیں سے کوئی ماٹھا لے گیا ہو مگر بالکل ہی بزدل پتیل کے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر جب حضرت بہت ہج ہو گئے تو شام کے وقت برجین نے الہم کا پتہ بتلایا۔

اسی طرح دن لطف سے گزرتے تھے۔ آپس میں چھڑ چھاڑ اور مزے مزے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میدانِ اُلفت میں جیں آگے

نیکل جاؤں مگر وہ نیکل کی محبتوں میں فرق تھا۔ کمال احسن غلطی محبت میں اپنے کو بالکل مچھل گیا تھا۔ یہ ٹھیک اس کے بچپن کی محبت فریض کی بنیاد پر قائم تھی۔ ہاں یہ خوشگوار فریض تھا جسے محبت کی چاشنی نے بہت بُر لفت بنا دیا تھا۔

تین سال اور گزر گئے۔ یہ نکل کی زندگی کے تین مبارک سال تھے۔ چوتھے سال کا آغا نایام مصیبت کی ابتدا تھی۔ بعض ہستیوں کو قدرت کی جانب دنیا کی نعمتیں اور کاموں نیاں اس بہتات سے ملتی ہیں کہ ان کے لئے دن سدا ہولی اور رات سدا اولی رہتی ہے۔ مگر کتنی ہی ایسی بد قسمت ہستیاں بھی ہیں جن کا پیمانہ مسرت چھوٹا اور پھیچھلا ہوتا ہے ایسا چھوٹا کہ آٹک میں لٹکی ہوئی سُرخی آنے سے پہلے ہی جام خالی ہو جاتا ہے اور مسرت کے چند لمحے زندگی کی سیاہ گھاٹی میں ایک بار بجلی کی طرح گونزدہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ جاتے ہیں۔ بوج رانی انہیں بد قسمتوں میں تھی۔

سببت کی رت تھی۔ سرد ہوائ میں چل رہی تھیں۔ سردی اس غضب کی بڑتی تھی کہ کنوئل کا پانی جھم جاتا تھا۔ اس وقت شہر میں طاعون کا سدھ ہوا نہرا لیا آدمی اسکی زندہ ہونے لگے۔ ایک روز شدت کا بجائے لگا۔ ایک گلی نکل اور بعض راہچی عدم ہو گیا۔ گلی کا نکلا گویا موت کا پروانہ تھا۔ کیا حکیم کیا فاکٹر کسی کا علاج کا گر نہیں ہوتا تھا۔ سینکڑوں گھر بے چراغ ہو گئے۔ ہزاروں بچے یتیم اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں جسکے جیدھر سینک سہائے ادھر بھاگ نکلا۔ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا مہر د اور غمخوار نہ تھا۔ والدین بچوں کو چھوڑ دیا تھا۔ عورتیں مردوں سے کنارہ کش ہو گئیں۔ گلیوں میں۔ سڑکوں پر مکاؤں میں جیدھر دیکھنے والا شتمل کےا کنارہ لگے ہوئے تھے۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔ دوسروں

میں قفل بڑ گئے چو طرف خاک مٹی تھی۔ مشکل سے کوئی جاندار چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا اور اگر کوئی ضرورت سے مجبور ہو کر گھر سے نکل پڑا تو وہ ایسی تیزی سے قدم اٹھاتا تھا کہ گویا موت کا سپاہی اس کے تعاقب میں ہے۔ ساری بستی ویران ہو گئی۔ اگر آباد تھا تو قبرستان یا شمشان چوروں اور رہزنوں کی بن آئی حلقہ دہائے قفل ٹوٹتے تھے اور آفاتِ مکی روشنی میں سینہیں پڑتی تھیں جو لوگ طاعون سے بچے انہیں ناقول لے آئے بوجھا۔ غرض عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔

بادشاہیاہن بہت مضبوط دل کے آدمی تھے۔ مکان کے چاروں طرف کے محلے خالی ہو گئے تھے مگر وہ ابھی تک اپنے مکان میں بیٹھتے و خطر آیا تھے مگر جب ان کا ایک سائیس مرگیا تو سارے کنبہ میں کھلبلی مچ گئی۔ اور دیہات چلنے کی نیاریاں ہونے لگیں۔ منشی جی نے اسی ضلع میں چند گاؤں خرید لئے تھے اور محنگاؤں نامی ایک موضع میں ایک وسیع مکان بنوا رکھا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ نیشن پلانے پر یہیں بود و باش اختیار کر دوں گا۔ کاشی چھوڑ کر اگر وہیں کون مر جائے برجن نے یہ تجویز سن کر بہت خوش ہوئی۔ دیہاتی زندگی کے روشن پہلو اس کی آنکھوں میں پھر رہے تھے۔ ہرے بھرے درخت اور سرسبز پہاڑاتے ہوئے کھیت ہرنوں کے جھنڈ اور جڑیوں کا چرچانا یہ بہاریں لوٹنے کے لئے اس کا دل بے قرار کر رہا تھا۔ کھلا چرن بھی شکار کھیلنے کے لئے ہندو صاف کرنے لگے۔ گر کا ایک فسطی جی نے اسے بل کر کہا کہ تم الہ آباد جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پرتاپ چند وہاں تمہارا انگیراں رہے گا۔ دیہات میں اوقات ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ اتنا سن کر تھا کہ کھلا چرن کی ٹانگی مر گئی۔ الہ آباد جانے سے صاف صاف انکار کر بیٹھا۔ بہت دیر تک منشی جی اسے

سمجھاتے رہے۔ گروہ جانے کے لئے تیار نہ ہوا، آخر ان کے ان اسخوی لفظ  
لے فیصلہ کر دیا۔ ”تمہارے مضموم میں علم لکھا ہی نہیں ہے۔ میری حماقت ہے  
کہ اس سے لڑتا ہوں۔“

برج رانی نے جب یہ تازہ تجویز سنی تو اسے بھی بہت سچ ہوا۔ عہدت  
کے مزاج میں خود بینی کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ ہمارے عفران کے دل میں بھی اپنی  
خو بصیرتی کی تعریف شکر گد گد کی پیدا ہونے لگتی ہے۔ برج رانی اب بھی سمجھتی  
تھی کہ کمال کا دھیان پڑھنے میں نہیں لگتا مگر یہ بخلاف اس کے ناگوار نہ معلوم ہوا  
بلکہ بعض اوقات اس کا جی چاہتا تھا کہ آج یہ مدرسے نہ جاتے تو اچھا ہوتا۔ کمال کی  
محنت آمیز آواز اس کے کانوں کو بہت پیاری معلوم ہوتی مگر جب اسے یہ معلوم ہوا  
کہ کمال نے الہ آباد جانے سے صاف انکار کیا اور للہ جی بہت سمجھا رہے ہیں تو اسے  
کچھ دنوں تک تنہا رہنا گوارا نہ تھا۔ جلنے اس کے کہ کمال کو اپنے والد کی نافرمانی کرتے  
دیکھے۔ مادھوی کو بھیجا کہ اپنے بھیا کو بلالے۔ مگر کمال نے جگہ سے ہلنے کی قسم کھالی  
تھی۔ سوچتا کہ اندر جاؤنگا تو وہ مزو سالہ اہلہ جانے کے لئے زور دے گی۔ اسے کیا خبر  
کہ یہاں دل پر کیا بیت رہی ہے۔ کاش اس کا دل مجھ پر جاتا۔ یوں بات چیت  
میں تو ذرا شکر گھول دیتی ہے مگر جب کبھی محبت کے امتحان کا موقع آتا ہے تو  
فرض اور مصلحت کے پردہ میں منہ چھپانے لگتی ہے جی یہ ہے کہ عورتوں میں  
وفا کی بوی نہیں ہوتی۔

جب رات زیادہ گزرنے لگی اور کمال جگہ سے نہ ہلا تو برج رانی خود آئی اور  
بولی :- ”کیا آج گھر میں جلنے کی قسم کھالی ہے۔ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں



پتھر اگئیں۔“

کملہ - اندر جاتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

برجن - اچھا چلو میں ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔ اب تو نہ ڈرو گے؟

کملہ - مجھے الہ آباد جانے کے لئے حکم ہوا ہے۔

برجن - میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔

یہ کہہ کر برجن نے کملہ کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ اُن میں انگور کے

خوشے لگے ہوئے تھے۔ کملہ ہار گیا۔ ان موہنی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کس کا جگر تھا

جو اپنی ضد پر قائم رہے۔ کملہ نے اسے گلے لگایا اور بولے: ”میں جانتا تھا کہ تم

جیت جاؤ گی۔ اسی لئے اندر نہ جاتا تھا“

ساری رات محبت کی الوداعی باتیں ہوئی رہیں۔ بار بار محبت کی زکا ہیں

مجھے غم ہوئی گویا وہ پھر کبھی نہ ملیں گی۔ افسوس! یہ جدائی آخری ملاقات تھی

برجن نے پھر کملہ کی صورت نہ دیکھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ قسمت ہمیں ہمیشہ

کے لئے جدا کر رہی ہے۔

## بحرن کے خطوط کلام

(۱)

پیارے محبت نامہ آیا۔ سراوہ آنکھوں سے لگایا۔ ایسے خطاتم نہ لکھا کرو دلجو  
پاش پاش ہو جاتا ہے میں لکھوں تو مضائقہ نہیں۔ یہاں طبیعت محنت لکھ رہی ہے کیا  
سننی تھی اور کیا دیکھتی تھی۔ لٹے پھوٹے پھوس کے جھونپڑے۔ ایک ایک بالشت کی  
بوسیدہ دیواریں لکھوں کے سامنے کوٹے کو کٹ کے بٹے بٹے ڈھیر کیچڑ میں لپٹی ہوئی  
سودیں۔ دہلی پتلی مرلے گاٹیں۔ یہ سب نظارہ دیکھ کر جی چاہتا ہے کہیں چلی جاؤں اور  
کو دیکھو تو خستہ حال۔ ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ پریشانی کی موندت۔ فلاں کی زندہ تصویر کسی  
بدن پر تباہت کپڑا نہیں۔ کیسے متمتع کے کھوٹے کہ رات دن پسینہ بہا ہے پر ہر جگہ بھی بھر پٹ  
روٹیاں بھینٹ رہی ہیں خیر نہا کے مکان کے کچھ اٹے ایک چھوٹی سی گڑھیا ہے۔ مادھی  
کھلی تھی پیر پھسلا تو بانی میں گر پڑی۔ یہاں شہر ہے کہ اس گڑھیا میں چڑھ لیں  
ہنا لے تیار کرنی ہیں اور وہ خواہ مخواہ راہ چلتوں کو چھیرتی ہیں۔ اسی طرح درد دانہ پر ایک  
پیش کا تناور درخت ہے۔ جھوٹوں کا بسیرا ہے۔ پیش کے جھوٹوں اور گڑھیا کی پرندوں  
میں بہت ملہ و ملا ہے۔ گڑھیا کا تو خیر بہت ثروت نہیں۔ مگر ان ہی سخت پیش  
کے جھوٹوں کا خوت سارے گاڑوں کے دلوں پر ایسا چھایا ہو گیا ہے کہ سر شام ہی  
راستہ بند ہو جاتا ہے سڑک کے اور عورتیں تو ادھر قدم ہی نہیں رکھتیں

ہاں اِکا دکا موبکھی کبھی گزر جاتا ہے۔ مگر وہ بھی گھبرایا ہوا۔ یہ دو مقام تو گویا ان پلید روحوں کے مکر میں۔ ان کے علاوہ صدیاں بھوت چڑیل مختلف مقامات میں آباد پائے جاتے ہیں معتبر روایتیں ہیں کہ چڑیلیں نظر آتی ہیں۔ گاؤں والوں نے ان کے مزاج پہچان رکھے ہیں۔ کسی بھوت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سر چڑھتا ہے تو مہنیز تک بیچھا نہیں چھوٹتا اور کوئی دوا دیکھنے میں پوجا لیکر الگ ہو جاتا ہے۔ گاؤں والوں میں ان امور پر اس طرح باتیں ہوتی ہیں گویا یہ بدیہی واقعات ہیں یہاں تک سُنا گیا ہے کہ چڑیلیں کھانا مانگنے اندر پانی لینے آیا کرتی ہیں۔ اُنکی سائیاں عموماً بگلے کے برکی طرح مصائب ہوتی ہیں۔ اور باتیں کسی قدر ناک میں کرتی ہیں۔ ہاں بگنے کا استعمال اُنکی قوم میں ساج نہیں۔ اُن کی نزدیکی جاننا خطرہ اُن جوان عورتوں کو ہوتا ہے جو بناؤ سزاگار کئے۔ رنگین کپڑے پہنے ایسی نظر آجائیں۔ پھولوں کی باس اُنکو بہت پسند ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی عورت یا لڑکا دھوپہر کو یا رات کو اپنے پاس پھول رکھ کر سوئے!

بھوتوں کے رتبہ اور اعزاز کا اقدار دانا ئی سے کیا گیا ہے۔ جوگی یا بابا آدمی رات کا لی کر یا اور صبح کھڑاؤں پر سوار گاؤں کے چاروں طرف گھومتے ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ بتاتے ہیں۔ سال بھر میں ایک بار اُنکی پوجا ہوتی ہے وہ آب بجائے بھوتوں کے دیوتاؤں کے مندر میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ کسی آفت کو حتی الوسع گاؤں کے اندر قدم نہیں رکھنے دیتے۔ اس کے برعکس دھوبی یا بابے پتھر پتھر مقرر کرتا ہے جس درخت پر اُنکی لویہ باس ہے اور ہر سے اگر کوئی چرل غ جلنے کے بعد کل جائے تو اس کے جال کی خیر نہیں۔ انہیں بھگائے کے لئے دو بوتل شراب کافی ہے

اُن کا پوجاری منگل کسن اس درخت کے تلے گا بنو اور جس رکھتا ہے ایک لاکھ صاحب  
 بھی بھوت بن بیٹھے ہیں یہ ذات شرعاً پوجاری تھے۔ انہیں چند برس زندہ اسامیوں نے  
 قتل کر ڈالا تھا۔ ان کی پڑتہ ہلاکی پکڑ ہے کہ بڑا جان بچو بچا نہیں چھوڑتی۔ کوئی پوجاری  
 یہاں سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم کہو گے کہ یہ کہاں سے بھوت پڑیل  
 کا پچڑا لے بیٹھی۔ میں کیا کروں۔ گاؤں سے ذرا فاصلہ پر ایک درخت ہے اُس پر بڑی  
 صاحب قیام کرتے ہیں وہی اے کسی کو نہیں چھوڑتے۔ ہاں مجھ مرات کے روز مجھ راتی  
 نہ پہنچ جائے تو بچوں کو مانتے ہیں۔

کیسی جہالت ہے! کیسی وہم پرستی! یہ خیالات ان لوگوں کے خیر ہو گئے ہیں  
 بچہ بیاہ ہوا اور بھوت کی پوجا ہونے لگی۔ کھیت کھلیاں میں بھوت کا حصہ شاید  
 بیاہ میں بھوت کا حصہ جہاں دیکھے بھوت ہی بھوت نظر آتے ہیں۔ یہاں دیو کی  
 نہ دیوتا۔ بھوتوں کا راج ہے۔ جہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔ وہیں بھوت ہی  
 قہنہ کرتے ہیں۔ ان خیالات کی کسو۔ اصلاح ہوگی اور کیا لکھوں۔

تمہاری بوج

(۲)

محبکا بٹل

پیارے شکر ہے بعد امت کے تمہارا پریم پتر ملا۔ کیا سچ پڑ خط لکھنے کی  
 بھی قدرت نہیں۔ خط کیا لکھا ہے گویا بیگار مالی ہے۔ تم میں تو برصاوت نہ تھی۔  
 کیا وہاں جا کر کچھ ادب ہو گئے مہرتیں یہاں سے گئے دو ماہ سے نہ۔ ہوتا ہے اس  
 درمیان میں کئی چھٹی بڑی تعطیلیں پڑیں مگر تم نہ آئے۔ مہرت : ہاں لڑکھتی

ہندہ ہولی کی تعطیل میں ہنونا نا، مگر ابکی ترسایا تو مجھے ہمیشہ شکایت رہی ہے کہ یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی دوسری دنیا میں آگئی ہوں، رات کو سوئی تھی کہ یکایک ہانا ہو ہو کا غل سنانی دیا۔ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکے گھر گھر سے لکڑی اور لپے وصول کرتے پھرتے ہیں، ہولی مانا کی ہی خدا کا ہے یہ مطلقاً بدترین چیز ہے۔ سچ کیا ایندھن کا، تھوڑا ہو گیا، کسی کی مجال نہیں ہے جو اس فوج کو دھوکے سے، ایک ہنونا کی منڈیا غائب ہوگئی اس میں اس بارہا بل آسانی سے بندہ جاتے تھے، ہولی والے کئی دن سے تاک میں تھے، موقع پا کر اڑا لیگے، ایک کرمی کا جھونپڑا اڑ گیا، کہتے ہی اُپلو دلا پتہ چھگے، لوگ اپنی لکڑیاں گھر در میں بھرے لیتے ہیں، لالہ جی نے ایک پیڑ ایندھن کے لئے مول لیا تھا، آج رات کو وہ بھی ہولی مانا کے منہ میں چلا گیا دو تین گھنٹوں کے کارائز گئے، پٹواری صاحب دروازہ پر سونے نہ تھے، انہیں تین پر عکیل کر لوگ چارپائی لے بھاگے، چوڑنہ ایندھن کی لوٹ بچی ہوئی ہے جو چیز ایک بار ہول مانا کے منہ میں چلی گئی، اُسے پھیر لانا بڑا بھاری گناہ ہے، پٹواری صاحب نے بڑی دھمکیاں دیں، میں جھجھندی بگاڑ دوں گا، جسٹس غلط لکھ دوں گا مگر کچھ اثر نہ ہوا، یہاں کا قانون رسمی ہے کہ ان لوگوں ہولی دلائے جو چیز پا جائیں بلا مزاحمت لیجاؤں، کون کسکی فری کرے، نوجوان بیٹا اپنے باپ کی آنکھ بچا کر اپنی ہی چیز اٹھوا دیتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی جماعت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

نفل تیار ہوگئی ہے مگر کاٹنے میں دو ہفتہ کی کسر ہے میرے دماغ پر سے میلہ کا منظر دکھائی دیتا ہے گیسپوں اور جو کے سنہرے کھیتوں کے کنارے گیسپ کے رخ اور عمرانی پھولوں کا حاشیہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے، چوڑنہ طوطے منڈلایا کرتے

ہیں مادھوی نے یہاں کئی مسکھیاں بنا رکھی ہیں۔ پڑوس میں ایک بڑا چھوٹا  
 رادھا نام ہے۔ پانچ سال ملا باپ طاعون کا شکار ہو گئے۔ مگر ہستی کے کل کا یہ اسی کے  
 سر پر ہیں۔ اُسکی بیوی تلسا کا لے یہاں کھڑا ہے۔ خوبصورت ناک سے درست  
 ہے۔ بات چیت کرنے میں شرارتی جاتی ہے۔ بھولی اتنی کہ جی چاہتا ہے گھنٹوں اُس  
 کی باتیں سن کر دے۔ مادھوی نے اُس سے بہتا پا کر رکھا ہے۔ کل اُن کی گڑبیل کا بیٹا  
 ہے۔ فلسی کی گرفتار ہے اور مادھوی کا گڈا۔ منہ سی ہوں بچاوی بہت غریب مگر میں نے  
 اُسکے چہرے پر کبھی میل نہیں دیکھی کہتی تھی کہ اُسے بچ کر دو رو سے جمع کر لیا ہے ملک  
 بد پیر جہیز دیکھی اور ایک پیر میں برائتوں کا کھانا پیتا ہوگا۔ گڑیا کے گھنے پڑے کا بوجھ  
 رادھا کے سر سے کیسی سادہ فاقہ بھری ہوئی معاشرت ہے  
 اب رخصت ہوتی ہوں۔ تمہارا وقت ہو اس سنہ میں ضائع ہوا۔ معاف  
 کرنا۔ تمہیں خط لکھنے بیٹھتی ہوں تو قلم رکتا ہی نہیں۔ اب بھی بہتری باتیں لکھنے کو  
 بڑی ہیں۔ پر تاپ چند سے میرا بالاکن کہہ دینا۔  
 تمہاری پرچہ

(۳)

مجھ کاؤں

پیارے تمہارا محبت نامہ ملا سینہ سے لگایا۔ خوب! چوری اور سینہ نو  
 اپنے نہ آنے کا الزام میرے سر رکھتے ہو۔ میرے دل سے کوئی پوچھے کہ اسے تمہارا  
 دیا کی کتنی آرزو ہے۔ اب یہ تمنا آدہ روز اضطراب کی صورت پر کھڑی جاتی ہے  
 کبھی کبھی بچپن میں ہو جاتی ہوں۔ میری یہ حالت تھوڑے ہی دنوں سے ہونے لگی ہے

حبس وقت یہاں سے گئے ہو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہاں جا کر میری دلیل کرو گے خیر تمہیں سچ  
 ادا میں ہی جھوٹ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے میرے دونوں خط پسند کئے۔ مگر پرتاپ  
 چند کو ناحق دکھائے وہ حالات بالکل قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ غلطیاں  
 رہ گئیں ہوں مجھے یقین نہیں آتا کہ پرتاپ نے انہیں بہت قیمتی سمجھا۔ اگر وہ میرے خط  
 کی اتنی وقعت سمجھتے ہیں کہ ان کے سہم لکھے سے ہماری دیہاتی معاشرت پر کوئی دلچسپ  
 مضمون لکھ سکیں تو میں اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔

کل یہاں یو پی جی کی بوجھاتی ہل چلی۔ پُر۔ جو لکھے سب بند تھے۔ دیوی جی کا  
 ایسا ہی حکم ہے۔ ان کے حکم کی نافرمانی کون کرے بھتہ پانی بند ہو جائے۔ سال بھر میں  
 یہی ایک دن ہے جسے گاؤں والے بھی تعطیل سمجھتے ہیں۔ رتن سنی دیوالی بھی روز مرہ کے  
 ضروری کام انہیں بند کر سکتیں۔ بکرا چڑھا۔ ہون ہوا۔ ستو کھلایا گیا۔ ایگاؤں کے  
 پوتے بچے کیلین کامل ہے کہ طاعون کا دورہ یہاں نہ ہو سکے گا۔ یہ سب تماشہ دیکھ کر سنی  
 تھی۔ قریب بارہ بجے ہوئے کہ سیکڑوں آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے بغل چلتے نکلے  
 او سائے گاؤں کا پھیر لیا جس کے معنی یہ ہیں کہ بیماری اس حد کے اندر قائم نہ رہ  
 سکیگی۔ طواف کے ختم ہونے پر چند آدمی دوسرے گاؤں کی حدود میں گھس گئے او  
 تھوڑا سا پان چاول لوٹ گئے ویزہ چیر میں زمین پر کھدیں یعنی اپنے گاؤں کی بلاد دوسرے  
 گاؤں میں فالدی جب یہ لوگ پتا کام پورا کر کے چلنے لگے تو اُس گلاؤں والوں نے سن  
 گن بل گئی سیکڑوں آدمی لاٹھی لٹیکر چڑھ دوڑے او دونوں فرق میں خبیثہ پریٹ  
 ہوئی۔ اس وقت گاؤں کے کئی آدمی کیلے ہیں۔

آج سویرے کل کے بچے کھینچے رسوم ادا کئے گئے جسے یہاں کی اصطلاح میں کرٹھانی

دینا کہتے ہیں۔ میرے روزہ پر ایک بھٹہ کھودا گیا، لو اس پر ایک کڑاہ دودھ سے  
 لبریز بکھا گیا کاشی نام کا ایک بھر ہے فیدل میں بھجوت لیاے آیا۔ گاؤں کے آدمی  
 ٹاٹ پر بیٹھے سکھ بچے لگا۔ کڑاہ کے چاروں طرف مالا پھول پکھیر دیا گیا۔ جب کڑاہ  
 میں خوب اُبال آیا تو کاشی کا ایک ٹھا اور چے کالی جی کی اکہر کڑاہ میں کود پڑا۔ میں تو بھی  
 اب یہ زندہ نہ نکلا مگر پارچ منہ کے بعد کاشی نے پھر حسرت مانی او کڑاہ کے باہر  
 تھا۔ اس کا بال بھی بیکانہ ہوا۔ لوگوں نے اسے مالا پہنائی اور ہاتھ جوڑ کر پوچھنے لگے۔  
 ہراج ایک فصل کیسی ہوگی۔ پانی کیسا برسے گا۔ بیماری آئیگی یا نہیں۔ گاؤں کے لوگ خیریت  
 سے رہیں گے، گرؤ کا بھادو کیسا برسے گا؟ کاشی نے ان سب سوالوں کے جواب مٹا  
 صاف مگر جودہانہ الفاظ میں دئے۔ اس کے بعد مجلس برخواست ہوئی۔ سُنتی ہوں کہ  
 جلسہ ہر سال ہوا کرتا ہے۔ کاشی کی پیشین گوئیاں سب سچی ثابت ہوتی ہیں اور کبھی  
 ایک آدھ غلط بھی نکل آتی ہے۔ تو کاشی ان کی تاویل بڑی خوبی سے کر دیتا ہے۔ کاشی  
 کو ضمیر شناسی میں بڑا ملکہ ہے۔ گاؤں میں کہیں چوری ہو کاشی اس کا پورا پتہ لگا  
 دیتا۔ جو کام پولیس کے بھیدیوں سے پورا نہ ہو۔ اسے وہ پورا کر دیتا ہے۔ اور گو  
 وہ ذات کا بھر ہے مگر گاؤں میں اس کی بڑی عزت ہے ان سب خدمات کا معائنہ  
 وہ بجز شراب کے اور کچھ نہیں لیتا۔ نام نکلا دئے مگر ایک بتل اس کے نذر کہیے! آپ کا  
 مقدمہ کچھری میں ہے کاشی اسکی فتح کی کوشش میں سرگرم ہے۔ میں اسے ایک بتل  
 اب سُرخ دیجئے۔

ہولی کا زمانہ بہت قریب ہے ایک مہفتہ سے زیادہ نہیں۔ اہا! میرا دل اس  
 وقت کیسا باغِ بلوغ مورہا ہے۔ دل میں مسرت آمیز گدگدی محسوس ہوتی ہے آنکھیں



تمہیں دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہی ہیں۔ یہ ہفتہ بڑی مشکلوں سے گئے گا اور تب ایسے اپنے مہیا کا درشن پاؤں گی۔

تمہاری پیاری برہی

(۴۷)

محکاؤں

پیارے! تم ظالم ہو۔ سنگدل ہو۔ بی وفا ہو۔ بیرحم ہو۔ بے ورد ہو۔ جھوٹے ہو اور میں تمہیں کیا گالیاں دوں اور کیا کوسوں۔ کاش تم اس وقت میرے سامنے نہ آتے تو اس سنگدلی کا مجھ اب ہمتی میں کہہ رہی ہوں۔ تم دغا باز ہو۔ میرا کیا کر لو گے۔ نہیں آتے ہو موت آؤ۔ اگر میری صورت سے بغیر ہو بہتر۔ اگر میری جان لینے پر آئے ہو شوق سے لیلو۔ لڑنا منظور ہے نلکو لکڑیوں سے روئل کیوں۔ میری بلاروئے جب آکھواتنا خیال نہیں کہ دو گھنٹہ کا سفر ہے دنا اُنکی خبر لیتا آؤں تو مجھ کیا غرض پڑی ہے کہ روؤں اور جہان کھوؤں۔

ایسا غصہ آ رہا ہے کہ خط چاک کر کے پھینک دوں اور تم سے پھر بات نہ کروں ہائے! تم نے میرے ارمان کیسے خاک میں ملا دیے ہیں۔ ہوئی! ہوئی! اس ایک لفظ میں میرے لئے جادو کا اثر تھا۔ کسی کے زبان سے نکلا اور میرے دل نے گدگدانا شروع کر دیا مگر افسوس! ہوئی گزر گئی۔ اوہیں ناکام آؤ نا مل رہی گئی۔ پہلے یہ لفظ سن کر دل میں گنگنی ہوتی تھی۔ اب کلیجہ سوست رہا ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے گاؤں کے چھوٹے لنگوٹی میں پھاگ کھیلیں خوشیاں منائیں۔ رنگ اٹائیں اور میں بیگنی اپنی چارپائی پر سفید ساڑی پہنے پڑی ہوں۔ قسم لیلو جو اُس پر ایک سرخ دھبہ بھی

پڑا ہوا قسم لیلو جو میں نے عبیر یا گلال ہاتھ سے چھوا ہو۔ میری عطر میں لپی ہوئی عبیر۔  
 کندھے میں کھولی ہوئی گلال۔ تکلف سے بچے ہوئے پلان صوبہ تہاری بے مہری کا دوناؤ  
 رہے ہیں۔ بادھوی نے جب بہت بہت کی تو میں نے ایک نسخہ ٹیکہ لگوایا مگر آج  
 سے ان شکایتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگرچہ کوئی کلمہ شفاءیت زبان سے نکلے تو زبان کا لینا  
 پر سہل سر شام ہی سے گاؤں میں چہل پہل چنے لگی۔ نوجوانوں کی ایک جماعت  
 ہاتھ میں دُٹے لائے گالی مغلظات بکیتی دوا دے دوا دے پھیرے لگائے لگی مجھے  
 معلوم تھا کہ آج یہاں اتنی گالیاں کھانی پر لینگے خرمناک لفاظ ان کے مُنہ سے ایسے  
 بے تکلف نکلتے ہیں جیسے پھول جھڑتے ہوں۔ شرم و حلاط کا نام نہ تھا۔ باپ بیٹے کے منہ  
 پر۔ بیٹا باپ کے سامنے گالیاں بکے رہا ہے۔ باپ لگا کر بہت سے کہتا ہے آج ہولی  
 ہے۔ بہو گھر میں سر نہ بچا کئے سنتی ہے اور سکرادیتی ہے۔ ہمارے پٹھاری صاحب گھر  
 ایک ہی حضرت نیک۔ آپ شرب میں محمور لشتہ میں جوڑا ایک میلی سی لپٹی سر پہ رکھا اس جماعت  
 پریشور دھتے اُنکی بہو بیٹیاں بھی اُن کے مغلظات کی طعنائی سے زح نہ سکیں۔ گالیاں کھاؤ  
 اور منہ سو اگر چہے رنڈا بھی ملے اُنے تو لوگ سمجھیں سکی محرم کی سید لیش ہے خوب آج ہے!  
 تیس بجے شب کے قریب یہ جماعت ہولی ماتا کے پاس پہنچی اور کے آتش بازی اور جھڑ  
 رہے ہیں میں بھی کئی عورتوں کے ساتھ گئی۔ وہاں عورتیں ایک طرف ہولیاں گا رہی تھیں  
 آئینہ ہولی میں آگ لگانے کا وقت آیا۔ آگ لگتے ہی دم کی دم میں شعلے بلند ہوئے  
 اور ساما آسمان سنہرے رنگ میں رنگ گیا۔ دیور دوتا کس کے بیڑ پتے منور ہو گئے اب  
 اس آتشکد کے چاروں رت لوگ بولی ماتا کی جھجھلا چلا کر دوڑنے لگے سبوں کے  
 ہاتھوں میں گیسول اور دھواں کی بالیاں تھیں جو وہ اس اللہ میں پھینکتے جاتے تھے۔ جیسے

بہت بلند ہو گئے تو لوگ ایک کنوے کھڑے ہو کر بھر کبیر کہنے لگے۔ دو گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی لکڑی کے کنوے سے چٹاخ پٹاخ کی آوازیں بھل رہی تھیں۔ موشی اپنے بچے کھوٹوں پر مائے دے کے چرخ رہے تھے تلسا نے مجھ سے کہا: "ابکی مولیٰ کی کوئیڑھی جا رہی ہے کٹھن نہیں۔ جب کوئیڑھی اٹھتی ہے تو گاؤں میں سال بھر خوشی کا دور رہتا ہے لیکن کوئیڑھا جانا منحوس ہے۔ آخر شعلے تھمے لگے۔ آج کی تیزی کم ہوئی۔ تب کچھ لوگ اللاد کے نزدیک آکر غور سے دیکھنے لگے۔ جیسے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ تلسا نے بتلایا کہ جب بسند کے دن مولیٰ کی بنیاد پڑتی ہے تو پہلے ایک اندھا گڑیہ تہ ہیں اس پر لکڑی اور ایلے کا ڈھیر لگایا جاتا ہے اس وقت یہ لوگ اسی رند کے پودے کی تلاش کر رہے تھے اس شخص کا بہادروں میں شہماں متا ہے جو سب سے پہلے اس پودے پر ایسا نشانہ لگائے کہ ڈوٹ کر دھماکے۔ پہلے بٹواری صاحب پینتیرا بنے آئے مگر دس گز کی دوری سے جھانک کر لوٹ گئے۔ تب راندھا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ لائے دلیرانہ قتل منہ لگایا ہے آگے بڑھا اور آگ میں گھس کر وہ بھر پور ہاتھ لگایا کہ پودا الگ جا کر لوگ ان ٹکڑوں کو لوٹنے لگے۔ ملے تھے پر اس کا ٹکڑا لگایا کرتے ہیں۔ اور اسے متبرک سمجھتے ہیں۔

یہاں سے غصت پا کر یہ مردانہ جماعت لوی جی کے استھان کی طرف بڑھی مگر یہ نہ سمجھنا کہ وہاں دیوی جی کا ادب کیا کیا ہوگا۔ آج وہ بھی گالیاں سننا پسند کرتی ہیں۔ چھپٹے پڑے سب ہنہیں مغلظات سنا رہے تھے۔ چند دن پہلے انہیں لوی جی کی پوجا ہونی تھی۔ حق یہ ہے کہ دیہات میں اس وقت ایسٹور کو گالی دینا بھی معاف ہے۔ ماں بہن کا تو کہیں شہماں ہی نہیں۔

سوہرا ہوتے ہی لالہ جی نے مہراج سے کہا: "آج کوئی دسیر بھنگ پسوالو! اسکی  
دوسیر ل لگ لگ بنوالو! نمکین اور شیریں۔ مہراج نکلے ادا کئی آدمیل کو پکڑ لائے۔ بھنگ  
پسی جانے لگی۔ بہت سے کلہر دمنگا کر صفائی سے رکھے گئے۔ دو مشکوں میں نو نوں قسموں  
کی بھنگ بنائی گئی۔ پھر کیا تھلہ تین چار گھنٹہ تک نشا تھلے کا آنا لگا رہا۔ لوگ خوب  
تبر لہیں کرتے اور سر ہلا ہلا کر مہراج کی کاگر ایلوں کی داد دیتے جہاں کسی نے قدر دانی  
کی اور مہراج نے دوسرا کلہر پھر ا۔ اور بے یہ نمکین ہے اس کا بھی سواد چکھ لو۔ اچی  
پی بھی لو۔ کیلہ روج روج ہوئی آئیگی کہ روج روج ہمارے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی ملیگی۔  
اسکے حجاب میں کسان ایسی نگاہوں سے تاکتے تھے گویا کسی نے اُسے نعمت دیدی۔  
اور ایک کے بدلے تین کلہر چٹ کر جاتے تھے۔ پٹواری کے داماد نشی جگد مہار پر شدا صاحب  
مشرافت لائے ہیں۔ آپ پکھری میں غرائفین نوں ہیں۔ اُنہیں مہراج لے اس قدر بلادی  
کہ آپ سے باہر ہو گئے اور نہ چسے کوڈنے لگے۔ گاؤں کا گاؤں اُنہیں آماج گاہ  
ظرافت بنائے ہوئے تھا ایک کسان آتا ہے اور اُنکی طرف مسکرا کر کہتا ہے کہ یہاں  
ٹھہرا بھی ہو۔ گھر جائے کھانا پکاؤ، ہم آتے ہیں۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑتا ہے۔  
کاشی بھر دو ہرانتہ جملے۔ لکھ کتا ہے پر رکھے ہوئے آتا ہے اور حاضرین کی طرف  
نقلی غصہ سے دیکھ کر کہتا ہے: "مہراج! یہ بات اچھی نہیں ہے کہ تم ہمارے فی بہریتے  
مجاوٹ ہو۔" یہ کہہ کر نشی جی کو سینہ سے چٹا لیتا ہے۔ نشی جی بیچاے مختصر آدمی  
ادھر ادھر پھر پھرتے ہیں مگر نقائے کی آواز میں طوطی کی کون سُنتے تھے۔ کوئی اُن کو  
چومتا ہے کوئی پیاد کرتا ہے۔ کوئی گلے لگاتا ہے۔ دو بہر تک یہی پھیر پھار ہوا کی۔ اُنکی  
دل لگی ایسی تھیدی اور غلیظ ہوتی ہے کہ کئی بار میرا جی بد مزہ ہو گیا۔ خود پھر ہو گیا لیکن

تلسا ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی، میں نے اُس سے کہا۔ آج ہمارے یہاں تمہارا بیوی  
 ہم تم ساتھ ساتھ کھائیں گی۔ یہ سنتے ہی جہاں دو تھالیوں میں کھانا نکلتا ہے، وہاں  
 لائیں۔ تلسا اس وقت کھڑکی کی طرف منہ کئے کھڑی تھی، میں نے جو اُس کا ہاتھ پکڑ کر  
 اپنی طرف کھینچا تو اُسے اپنی پیادہ پیادہ لگھل سے موتی کے دانے نکھیرتے ہوئے پایا۔  
 نکلے لگا کر بولی۔ ”سکھی سچ سچ بتلاؤ، کیوں رو رہی ہو۔ ہم سے کوئی پرہیز مت رکھو۔ اس پر  
 وہ اُدھمی سسکنے لگی۔ جب میں بہت لفند ہوئی تو اس نے سر ہچکا کر کہا۔ ”یہیں  
 آج سیدے اُن پر نشان پڑ گیا۔ نہیں معلوم اُن پر کیا سیت ہی ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ ناظرہ قطار  
 رونے لگی۔ معلوم ہوا کہ رادھا کے ہاتھ کچھ قرص لیا تھا وہ ابھی تک ادا نہ ہو سکا۔ جہاں  
 نے سمجھا اسے حال لگنے چلوں تو وہ سیدو مول ہو جائے۔ رادھا کوئی کاسا پھرتا تھا۔ آج  
 حریفوں کو موقع مل گیا اور وہ اپنا کام کر گئے۔ افسوس! مواخذہ بیس و پیر سے ناہید نہ تھا  
 پہلے مجھے معلوم تھا تو غریب پر برس برس کے دن یہ مصیبت نہ آنے پائی۔ میں نے چپکے سے  
 جہاں کو بٹھایا اور انہیں بیس بٹھالے دیکر رادھا کو رہا کرنے کے لئے روانہ کیا۔

اس وقت میرے دو ذراہ پرایک ٹاٹ بٹھلایا تھا۔ ”اللہ جی! سچ میں قالین پر بیٹھے  
 تھے کسان لوگ گھٹے ٹنگے ہو تیل باندھے۔ کوئی کُرتہ پہنے، کوئی ننگے بدن۔ کوئی  
 سر پر گڑھی باندھے۔ کوئی ننگے سر نہ پر عبیر لے (جو انکی کالی صورت پر خاص کیفیت پیدا  
 کر دیتی تھی) اُنہ لگے جھوٹا لالہ جی کے پیوں پر تھوڑی سی عبیر رکھ دیتا۔ لالہ جی بھی اپنی  
 طشیری میں سے ذرا سی عبیر نکال کر اس کسے تھے پر لگا دیتے اور مسکرا کر کوئی دل لگی  
 کی بات کہہ دیتے۔ وہ سنہال ہو جاتا۔ زمین دزد ہو کر سلاہم کرتا اور ایسا خوش خوش آ  
 کر بیٹھ جاتا تو اُسے کوئی دولت ملی ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ لالہ جی

ان اُجڑے پھاٹیوں کے ساتھ بیچکر ایسے مزے سے باتیں کر سکتے ہیں، اسی ناشیہ کشی بھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سیالی ہتی اُس میں عبیر لے کر بیٹھا تھا۔ اُس نے اوروں کی طرح عبیر لالہ جی کے پیروں پر نہیں رکھی بلکہ بڑی طہری سے ٹھٹھی بھر لیکر اُن کے چہرے پر اچھی طرح ملادی میں تو قندی کہیں لالہ جی بد مزہ نہ ہو جائیں مگر وہ بہت خوش ہوئے اور خود بھی بجلے ایک ٹیکہ لگانے کے دونوں ہاتھوں سے اُس کے منہ پر عبیر ملی۔ بعد ازاں اُسکر اکر کہا۔ ”آج اپنے گھر میں کہہ دینا ہمارے لیے بچھاؤں تیار رہے۔“ کاشی نے بھی اُسی طرح اُسکر اکر کہا۔ ”سرکار ہم برس برس کے دن کہاں جائیں گے۔“ اس وقت کاشی کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اپنی نگاہ میں اپنے تمام ساتھیوں کا راجہ معلوم ہوتا تھا اس کے ساتھی بھی اُسکی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہمتیاب تو سیر رہے اور تو اس قابل ہے کہ ہمارا سردار بنے اسی طرح ایک ایک کر کے دوڑھائی سو آدمی جمع ہو گئے۔ یکا یک انہوں نے کہا۔ ”ہرج کہیں رادھا منہیں نظر آتا۔ کیا یا تبے کوئی اُس کے گھر چلے دیکھے تو خنسی جگد مہارشا اظہارِ لیاقت کا اچھا موقع دیکھ کر بول اُٹھے۔“ حضور تو علت قرصہ زیر دفعہ ۱۱ نمبر الف ایکٹ (ج) بکر فارمہ گیا۔ رادین پانڈے نے وارنٹ کا خرچہ داخل کر دیا تھا جنہیں اتفاق سے رادین پانڈے بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اللہ نے اُنکی طرف نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”کیوں پانڈے جی، اس غائب کو حوالات میں بند کرانے سے تمہارا گھر بھرا جائیگا یہی انسانیت اور شرافت اے جی ہے۔ بہتیں ذرا بھی رحم نہ آیا کہ مہلی کے دن اسے بیوی بچوں سے الگ کر دیا میں تو یہ ایمان کہتا ہوں کہ اگر میں رادھا ہوتا تو حیلانہ سے وہاں آئیے بعد میں یہی کوشش ہوتی کہ جس نے مجھے بدین دکھایا جملے میں بھی کچھ دنوں

ہلدی پلو اڈوں۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اتنے معتبر مہاجن ہو کر تم نے بیس لپے کے لئے ایک غریب آدمی کو بیل مہسبت میں ڈالا۔ ڈوب کرنا چاہیے! ایسی لالچ پر ”اللہ جی کو واقعی غصہ آگیا تھا۔ راجدین ایسا خفیف ہوا کہ سب سٹی پیڑ بھول گئی۔ منہ سے بات نہ نکلی۔ چپکے سے پچھری کی طرف چلے۔ سب کے سب کسان اس کی طرف غصہ ناک لگا ہوتے ہاں رہے تھے۔ اگر اللہ جی کا خوف نہ ہوتا تو پاؤں سے جی کی بڑی پسلی وہیں چھو جاتی۔

اس کے بعد اللہ جی گھر میں آئے اور اپنے کمرہ میں ٹھیکہ ربت غنیمت سے کچھ مشق کرنے لگے۔ باہر حاضرین محفل نے گانا شروع کیا۔ نشہ میں آتے سب کے سب چمک رہے تھے۔ اس پر اللہ جی کے ان بڑاوارانہ خاطر و مدارت نے ان کے دل کو اور بھی اچھا کر دیا تھا۔ خود ہی جی توڑ کر گایا۔ ڈفلی تو ایسی نوسے بجتی تھی کہ اب بھٹی اور اب بھٹی۔ جیکر مبارشا د نے دوسرا نشہ چمایا تھا۔ کچھ تو ان کے دل میں خود بخود امنگ پیدا ہوئی۔ کچھ دوسروں نے استعفا لے لیا۔ آپ بیچ مجلس میں کھڑے ہو کر ناچنے لگے۔ یقین مانو ناچنے لگے میں نے اچیکن ٹوپی دھوٹی اور موچکوں والے آدمی کو ناچنے نہ دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے تک بندوں کی طرح اچھلنے کودتے رہے۔ آخر نشہ نے انہیں زمین پر سلا دیا۔ ان کے بعد ایک اور ایڑھا ایک ایک ہیرن بھی زمانہ جماعت سے نکلی اور دونوں میدان میں جا کر ناچنے لگے۔ دونوں نوجوان تھے اور پھر تیلے اکی کر اور پشت کی لچک واقعی حیرت انگیز تھی۔ دُف تال دے رہا تھا۔ ان کے رزم و کسائے عشق و غم نے۔ کمر کا لچکان اور بولی ٹپنی کا پھر کنا۔ گردن کا موڑ اور اعضا کا مروڑ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ بہت مشق اور محنت کا کام ہے مگر اکثر ادائیں اور کناٹے سبھی اسی سے بے شرمی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ تلسا بھی ناچتی ہے۔ مگر رادھائے سوا اور سی کے ساتھ نہیں اندیہی چاہیے بھی ۛ

ابھی یہاں ناچ ہی ہو رہا تھا کہ سامنے بہت آدمی لمبی لمبی الٹھیاں کندھوں پر رکھے آتے دکھائی دئے اُن کے ساتھ ایک ڈن بھی تھا اور کئی آدمی ہاتھوں میں جھانچہ اور ٹھیسرے لئے ہوئے تھے وہ گاتے بجاتے آئے اور ہمارے دروازے پر رُکے۔ ایک ایک تین چار آدمیوں نے ملکر ایسی زور سے آر۔ر۔ر۔ کہیں کا لغزہ لگایا کہ مکان ہل گیا۔ لالہ جی نکلے۔ یہ لوگ اسی موضع کے تھے جہاں نکاسی کے دان لٹھیاں چل رہی تھیں۔ لالہ جی کو دیکھتے ہی کئی آدمیوں نے ان کے منہ پر عبیر ملی۔ لالہ جی نے بھی جواب دیا پھر لوگ فرش پر بیٹھے۔ لالہ جی اور پان سے خاطر کی گئی۔ اس گاؤں والوں نے بھی غیب میں اور ملے اس پر یہ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہ ہولی گائی۔

مسدا اندر ہے اس دوائے مہربان کھیلیں ہوئی  
گلتا خواہیہ رت گیت ہے۔ مجھے تو اس میں جذبہ اور اثر کوٹ کوٹ کھڑا  
معدیہ ہوتا ہے۔ ہولی کی غرض اور غایت کیسے سنئے اور محض الفاظ میں بیان کر سکتا  
ہے۔ سدا اندر ہے اس دوائے مہربان کھیلیں ہوئی میں بار بار یہ پیارا گیت گاتی ہوں  
اور مزہ لیتی ہوں ہولی کا تہوار آپس میں اخلاص و پیار و محبت و اتحاد پر بھانے کے لئے  
ہے لیکن نہ تھا کہ وہی لوگ جن سے چند روز قبل ہاتھ پھڑکنے کو بت ابھی تھی۔ ان گاؤں  
میں یوں بے مہربانیاں چلے آتے مگر یہ میں وہاں پہنچے آج کسی کو اس سے دشمنی نہیں ہے۔  
آج امر کی بادشاہت ہے۔ آج محبت و مہربانیت کا راج ہے۔ آج خوشی کا دھواں  
آج کے دن اگر کچھ کمرے تو رہیں بالعموم کہ ہمارے لئے تو خوشیاں ہوں۔ ان کے سوا کوئی  
سبکے لئے خوشی کا حلال ہے غرض کہ خوب مزہ کھراؤ خوب گچھڑے اڑاؤ۔  
آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک لالہ جی کی میتیں اداوار۔ ر۔



کہتی مرنی سنائی دی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی وہی  
کانوں پر ہاتھ دھرے اور۔۔۔ زکی ہانک لگا رہے ہیں کبیرہ ہے۔  
ہولی کے دن آئے پیارے کہ گھر گھر دھندھورا دیا پھیلے۔  
جو زُبابِ مدرانہ پیئے، اُکو ساؤں جنم لائے۔

خُب اللہ جی کی زبان سے ادویہ ہوئی! شام کے دقت گاؤں کی سڑمیتیں  
مہارے یہاں ہوئی کھیلے، میٹیں سرائیک اپنے اپنے گھونٹے میں گھولی ہوئی بکیرے ہوئے  
تھی اس نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا۔ رنگ کھیلا، پان تقسیم کیا۔ میں آکر خوف  
کے باہر نہ نکلی اس طرح بجات ملی۔ اب مجھے خیال آیا کہ ادھوی دوپہر سے عائبہ ہے۔  
میں نے سوچا تھا کہ شاید گاؤں میں سولی کھیلے گئی ہو مگر ان غورقوں کے ساتھ تساہ  
تھی ڈابھی تک جب پاپ من بے کھڑکی کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی چراغ میں تپتی  
پڑ رہی تھی کہ وہ دیکھا ایک اُٹھی اور میرے پیروں پر گر کر روتے لگی میں نے کھڑکی کی طرف  
جھانکا تو دیکھتی ہوں کہ آگے آگے مہراج۔ اُن کے پیچھے رادھا اُس سب سے پیچھے رادین  
پاندوے چلے آ رہے ہیں۔ کانں کے بہت سے آدمی اُن کے ساتھ ہیں۔ رادھا کا چہرہ مچھلیا  
ہوا ہے اللہ جی نے جوں ہی سنا کہ رادھا آگیا۔ چٹ باہر نکل آئے اور بڑی محنت سے  
اُسے گلے لگا لیا۔ جیسے کوئی اپنے بیٹے کو گلے لگاتا ہے۔ رادھا چینی مار مار دے لے مگا  
تسا سے بھی غبطہ نہ ہو سکا، وزیر سے اُتری اور اللہ جی کے پیروں پر گر پڑی۔ اللہ جی نے  
اُسے بھی بڑی محبت سے اُٹھایا۔ میری آنکھوں سے بھی سوت غبطہ نہ ہو سکا گاؤں  
کے بہت سے آدمی دوپہر تھے نہایت دردناک سین تھا اللہ جی کی آنکھوں میں لیا  
نے کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے وہ اس وقت دیکھے رادین پاڈے سر نیچا کئے ایسا کھڑا

تھا جیسے گنو ہتیا کی ہو۔ میرے روپے مل گئے مگر نیت ہے اُسے ٹلس کے لئے ایک  
گلے لینے میں خرچ کروں۔

رادھا اور ٹلس دونوں اپنے گھر گئے مگر ذرا دیر میں ٹلس مادھوی کا ہاتھ پکڑے  
مستہ ہونے میں کمرہ میں آئی اور بولی۔ ”اے بچہ چھو یہ اب تک کہاں تھیں؟“  
میں۔ کہاں تھیں تم؟ دپہر سے غائب ہو۔  
مادھوی۔ یہیں تو تھی۔

میں۔ یہاں کہاں تھیں میں نے دپہر سے رہیں دیکھا سچ سچ بتاؤ میں نا راض نہ ہوں گی  
مادھوی۔ ٹلس کے گھر تو چلی گئی تھی۔

میں۔ ٹلس تو یہاں بیٹھی ہے۔ وہاں اکیلے کیا سوتی ہیں؟  
ٹلس اسٹہسکا سوتی کا سیکور ہیں جاگتی رہیں کھانا پکاتی رہیں پھکارتن کرتی رہیں۔  
مادھوی۔ ہاں چوکا برتن کرتی رہیں۔ کوئی تمہارا ٹوکرا لگا ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ جب سے میں نے ہرجا کو رادھا کو پھڑکنے کے لئے روانہ کیا تھا  
تب مادھوی ٹلس کے گھر کھانا بنانے میں مصروف تھی اس کے کوارٹھم کے یہاں سے  
آنا لکھی۔ سب سب لگئی آگ جلائی اور یو ریاں کھریں۔ بچے۔ بیٹھے سموت سنبڑی  
نغارت سے بنائے۔ اس نے سوچا تھا کہ سب بڑا کچھکے سے چلی جانو گی۔ جب  
رادھا اور ٹلس آئیں گے تو تعجب رہیں گے کہ کون ہے؟ مگر غالباً دیر ہو گئی اور مجرم کچھ لایا  
دیکھو کیسی نیک نیت لڑکی ہے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد خدمت میں ہوں۔ ٹلس کے متعلق متعاف کرنا۔ تمہاری جیری  
میں جیسے رکھو گے ویسے رہو گی۔ عیسارادہ کھلاؤ بھینچتی ہوں۔ یہ تمہاری کنیر کا حق ہے۔

تمہیں ہماری قسم جھوٹی تہذیب کے جوش میں آکر اسے پھینک دینا ورنہ میرا دل دھکیگا  
تمہاری برجن

(۵)

مچکاؤں۔

پیارے! تمہارے خط نے بہت دلایا۔ اس میں رہا جاتا۔ مجھے بلو۔ ایک نظر  
دیکھ کر علی آگئی۔ سچ بتا۔ اگر میں تمہارے یہاں آ جاؤں تو مگر سے پن لے تو نہ لوں  
نہیں معلوم دلیں یا سمجھوں، مگر کیسے آؤں۔ تم لالہ جی کہ کھو ڈب۔ وہ کہتا ہے یہ نئی دلیں  
سمائی ہے کل چارپائی پر بڑی مٹی سویرا نہ گیا تھا۔ خوب ٹھنڈی ٹھنڈی دلیں دلیں  
چل رہی تھی کہ عورتوں کے گئے کی آواز کان میں آئی۔ عورتیں انا قاتلے نہ ہو۔ وہ بھڑ  
بھڑا کر دیکھا تو اس میں بار بار سو قاتل کی ایک ایک۔ سچ جوت مگر، سمجھا۔ کہ  
ہاتھ لایا۔ ہنسنا بند ہے پر گھٹیا بانہ جسے کہتی اور سر رہے ہیں۔ یہ دیکھ پو۔  
بھٹی یہ موقت جاتی ہیں کہیں بانہ نہ گئے دلیں گی۔ پس میں تجھے پس۔ پس کہیں نہ چل  
جاتی نہیں، وہ گہست بھی کیا۔ سہانا خدا۔

اورا سبیاں گھر آئے رتیاں

جس ڈھکلیاں میں سچ بچا دیا سچ نہ سہ۔ دے دھرے فوسا بیٹا

مورے سیدیاں گھر آئے۔ رتیاں

مورے کا وقت مستانہ آوڑیں۔ مسترے بھرے ٹٹے دل یہ گیت بہت مزید  
معدوم ہوتا تھا۔ ٹٹے سبیاں گھر آئے کیا میرے گھر بھی سبیاں آئی گئے؟  
دو پہر تک یڑی خیریت سمجھوڑی۔ یکا یک آسمان پر بادل چھایا۔ آہ بھی آگئی۔

اور ادا دے کر لے لگے میں نے اتنے بڑے ادا لے کر لے کر دیکھتے۔ آواز بڑے اور ایسی تیزی سے گرے جیسے بندق کی گولی۔ دم کی دم میں زمین پر ایک فٹ اونچا ادا لے کا سفید فرش بچھ گیا۔ چوڑے سے کسان بھلا گئے لگے۔ گائیں بیل، بکریاں سب چلائی ہوئیں۔ پٹرول کا سایہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ میں ڈری کہ نہیں معلوم تلسا پر کیا بیٹی۔ نظر ڈال کر دیکھا تو ایک کھلے میدان میں جو انداز کے کٹ جملے سے کھت دست چور ہاتھا۔ تلسا۔ مادھا اور موسیٰ گائے نظر آئیں۔ تین دن گھمسان ادا لے کی زد میں پڑے ہوئے تھے۔ تلسا کے سر پر ایک چھٹی سی ٹوکری تھی اور رادھا کے سر پر ایک بڑا سا گھنٹا۔ میری آنکھیں میں آنسو بھر آئے کہ نہیں معلوم ان بیچاروں کا کیا حشر ہوگا۔ دانت پر ایک سخت جھوٹے نے رادھا کے سر سے گھٹا کر دیا۔ گھٹا لگا کر نا تھا کہ دم زد میں تلسا نے اپنی ٹوکری اس کے سر پر ادا دھادی۔ نہیں معلوم اس پھیل سے جسم پر کتنے ادا لے پڑے۔ اُس کے ہاتھ کبھی پیٹھے پر جلتے کبھی سر سے ملاتے۔ ایک سینکڑتے زادہ میرا ہاتھ رہتی ہوئی۔ کہ رادھا نے بجلی کی طرح جھپٹ کر گھٹا اٹھا لیا۔ اور ٹوکری تلسا کو دے دی۔ کیسی زبردست محبت ہے!

ظالم آسمان نے سائے سامان بگاڑ دیے۔ سویرے عورتیں لگاتے ہوئے جامہ ہی عتیں۔ شام کو گھر گھر ماتم بپا تھا۔ کتنوں کے سر لوہاں ہو گئے۔ کتنے ہلکی پی پٹھ فصل ستیاناس ہو گئی۔ انا جھپٹ کے تلے دب گیا۔ بخار کا زور ہے۔ سارا گول اسپتال بنا ہوا ہے۔ کاسٹی جھری پیشگیئی، صادق آتی۔ ہولی کے شعلوں کا رادھا ہر سو گیا فصل کا پھل ادا مالگنداری وصول کی جا رہی ہے۔ بڑی بدعت ہو رہی ہے۔ مادھا بگالی کھتے غرض سبھی ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے۔ غریبوں پر یہ قہر خدا

متمادی برجن

### مچکدوں

میرے جان سے پیارے بالم۔ پورے پندرہ دن کے بعد تم نے برحق کو یاد کیا۔  
خط کو بار بار پڑھا۔ چھوٹے آنکھوں سے لگایا اور ایک ایک حرف کا مزہ لیا۔ مہتابرا خط ملا  
نلکے نہیں مانتا میں ویسا بھی بہت دھیا کمٹی ہوں۔ تھکوں کن باتوں کی یاد دلائوں۔  
میرادل ایسا کمزور ہے کہ جب تک بھی ان باتوں کی طرف خیال جاتا ہے تو عجب بیچینی سی  
ہو جاتی ہے۔ گمراہی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بڑا بیچیں کر نیوالا۔ بڑا بامزہ۔ بہت  
نکلا نیوالا۔ بہت پر حسرت در دھوس ہونے لگتا ہے۔ جانتی ہوں کہ تم نہیں آہے  
اؤناؤ کے مگر بابا بار دوا زہ پر جا کر کھڑی ہو جاتی تھیں کہ تم آؤ نہیں گئے۔ یہ جھکنا تمہارا  
لئے ایک ریشمی بوتے دا قیض تیا کر رہی ہوں جی چاہتا ہے تم یہاں آتے۔ میں ہنسی  
ذرا ظہرو۔ دیکھو ٹھیک کٹی ہے یا نہیں۔ تب سلائی طے کرنے لگتی۔ تم کچھ بول دیتے۔  
میں کچھ اور مانگتی۔ مگر لا۔ اسی باتیں نہ کرونگی۔ مہتابرا ہرج ہوگا۔

کل شام کو یہاں ایک بڑا دلیریب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ یہ صوبوں کا ناچ تھا۔  
پنیدہ بیس آدمیوں کی ایک جماعت تھی ان میں ایک نوجوان شخص سفید پشواڑ پہنے  
کمر میں پشما رکھنیاں باندھے تھے یہیں گھوم پھرو پہنے۔ سر پر ایک لٹو پی رکھے ناچ رہا تھا  
جب یہ شخص ناچتا ہے تو مردنگ بجنے لگتی ہے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ پہلی کا انکا  
مانگئے آئے ہیں۔ یہ ذات بھی عجیب نعام لینے والی ذات ہے۔ آپ کے یہاں کوئی  
کام کاج پڑے تو نہیں انعام دیجئے۔ اومان کے یہاں کوئی کام کاج ہو تو بھی انکا  
دئے جائیے۔ یہ لوگ نہایت وقت گزرت نہیں گاتے۔ ان کا گانا ان کی شاعری

ہے۔ لیکن ذوالاشخص ڈھول پر ہاتھ کھڑا کر ایک برا کہتا ہے دوسرا آدمی سامنے سے آکر اس پر ہرے کا جواب دیتا ہے۔ اور دونوں فی البدیہہ کہتے ہیں۔ اس ذات میں شعور نہ ظاہریت بہت زیادہ ہے۔ ان برہمنوں کو غور سے سنو تو ان میں بعض نہایت باریک شاعرانہ خیالات ادا کئے جاتے ہیں۔ پشواؤ والے شخص نے پہلا برا جواب کہا تھا اُسکے یہ معنی تھے کہ اے دھوبی کے بچو تم کس کے دواؤں پر اکھڑے ہو۔ دوسرے نے جواب دیا تھا۔ اب نہ اکبر شاہ ہے نہ راجہ بھجج۔ اب جو ہیں ان کے مالک ہیں۔ انہیں سے انگوٹیاں سرے پر ہے کا مطلب تھا کہ مسکتنوں کی عزت کم ہو جاتی ہے اس لئے تم لوگ کچھ سوال مت کرو گا بجا کر چلے چلے۔ دینے والا این مانگے ہی لے لے گئے۔ بھرتک یہ لوگ برہمن کہتے رہے ہمیں یقین نہ آئی کہ ان کے منہ سے برہمن اس طرح بے تکلف نکلنے سے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شاید اتنی آسانی سے وہ بات چیت جی نہ کر سکیں۔ یہ ذات بڑی بلا نوش ہے۔ نہتا دھبکی پیکڑ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں۔ سیاہ میں شراب۔ گولے میں شراب۔ پچائیت میں شراب۔ پوجا پاٹ میں شراب۔ انعام مانگیں گے تو پینے کے لئے۔ دھالائی مانگیں گے تو یہ کہہ کر کہ آج پینے کو پیسہ نہیں ہے رخصت ہوتے وقت بیچو دھوبی نے جو دعائیہ برا کہا تھا وہ شاعرانہ استعارات سے بھرا ہوا ہے۔

تمہارا پر والا اس طرح بڑے جیسے گنگا کا پانی لڑکے پھیلیں پھولیں جیسے آم کی بوڈ۔ مالکن کا سہاگ سدا بنار ہے جیسے دُوب کی سریالی۔ کیسی نادر شاعری ہے۔ زیادہ بجز اشتیاق دیدار کے اور کیا لکھوں؟

تمہاری برجن

### مچھلاؤں

سیارے ایک ہفتہ تک خاموش رہنے کی معافی چاہتی تھیں خوب! آپکو شک ہے  
 ذہنیت کا کیسا نادار موقع ہاتھ آیا ہے۔ واہ! بے ہوش دھڑی۔ مجھ پر یہ الزام کہ ہفتوں سے  
 نہیں دیتی ہو۔ بجا ذمہ نہ میرے خطوط گن کر دیکھو۔ ابھی کچھ نہیں تو نصیحت درجن پستیوں  
 کے دیندا رہو گئے مجھے اس ہفتہ میں بالکل فرصت نہیں ملی۔ مادھوی بیمار ہو گئی۔ ممتا  
 پہلے تو کنوین کی چند پڑیاں کھلائی گئیں مگر جب اس سے افلاک نہوا اور اس کی حالت  
 بہت خراب ہو گئی تو دہلورائے بیدار ملے گئے۔ وہ آپ پاس کا سن ہوگا۔ برہنہ  
 سر پر ایک پگڑھی باندھے۔ کندھے پر انگوچھا رکھے۔ ہاتھ میں ٹوٹا سا سوتھالے  
 دروازہ پر آکر بیٹھ گئے۔ گھر کے بڑے زمیندار ہیں مگر ان کے بدن پر کسی نے سیدھی مرنائی  
 نہیں لکھی۔ انہیں اتنی فرصت ہی نہیں کہ اپنی تن پروری کی طرف متوجہ ہوں۔ سڑج  
 میں آٹھ دس کوس تک لوگ ان کے معتقد ہیں۔ نہ وہ حکیم کو جانیں۔ ڈاکٹر کو۔ انکا حکیم  
 ڈاکٹر جو کچھ ہیں وہ دہلورائے ہیں۔ پیغام سننے ہی آکر دروازہ پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں  
 کی طرح نہیں کہ پہلے سواری مانگیں گے وہ بھی چاق چیت تاکہ ان کا وقت متاثر نہ ہو  
 آپ کے گھر آکر ایسے خاموش بیٹھ رہیں گے گویا گونگے کا جڑ کھا گئے ہیں۔ مریض دیکھنے  
 جانیں گے تو اس طرح بھاگیں گے گویا کمرہ کی ہوا میں زہر بھری ہوئی ہیں۔ شخصیں روض  
 تجویز دو اسب پچھ دو منٹ غیر متہ! دہلورائے ڈاکٹر نہ ہی مگر جتنے آدمیوں کان کی  
 ذرا سیے نیچن پہنچتے ہے انکی تعداد کا اندازہ کرنا محال ہے۔ عہدہ نہ انکی کا استعمال ہے  
 انکی صورت دیکھتے ہی مریض کا آدھا رنگ درہو جاتا ہے ان کے سننے کیسے ہل

اور ناکہ بلاد اکوڑی خرچ کئے منوں بٹور لائے۔ تین ہی دن میں دھوی چلنے پھرنے لگی۔ واقعی اس شخص کو وہ اس عجز ہے۔

یہاں ان دنوں مغلے اڑھم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ چارے میں کپڑا دیے جاتے ہیں اور جیت میں دم وصول کالیتے ہیں۔ اُس وقت کوئی غلہ نہیں سننے گا۔ گلوں مار پیٹ۔ سبھی بالوں پر اتر آتے ہیں۔ دو تین آدمیوں کو بہت مارا۔ رادھالے بھی کچھ کپڑے لئے تھے۔ اُس کے وہاں سے پر جا کر سب کے سب گالیاں پکے لگے۔ تلسا نے اندر سے کڑا بند کر لئے جب یوں میں نہ چلا تو ایک نے موہنی لگے کھونٹے سے کھول لی اور کشتہ لٹا چلا۔ اسے میں رادھا دود سے آتا دکھائی دیا۔ آتے ہی آتے اس نے اٹھی کا وہ بھر لوہا کھدیا کہ مغلے کی کلائی ٹٹک پڑی۔ تب تو مغلے گرم ہوئے۔ یہ سننے سے بد لئے لگے۔ رادھا بھی جال پر کھیل گیا اور دو تین بد معاشوں کو بیکا کر دیا۔ اسے میں کاشی بھرے آکر ایک مغلیہ کی جبری۔ دہلورے کو مغلیوں سے چڑ ہے وہ فخر یہ کجا کہتے ہیں کہیں نے انکا اتنا روپیہ دے دیا دیا۔ اتنے کو بٹوایا۔ یہ شور و غلہ سنتے ہی پہنچے اور لٹکرا۔ صدمہ آدھی لاکھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور مغلیوں کی غور مرست ہوئی۔ یقین ہے کہ اب ادھر آنے کی جرأت نہ کریں گے

اب تو منی کا مہینہ گزرا۔ کیا ابھی فرصت نہیں ہوتی۔ رات دن تمہارے آنے کا انتظار ہے۔ شہر میں عیادت کم ہوگئی۔ اور ہم لوگ بہت جلد یہاں سے چلے جائیں گے۔ افسوس تم اس پیارے گاف کی سیر نہ کر سکو گے :

تمہاری برحق



(۸)

پیارے تمہاری خوشی مارے ڈالتی ہے۔ کل ہم لوگ شہر آگئے۔ اب تم بھی لاؤ  
وہاں بڑے بڑے کیا کر رہے ہو۔ دو تین خط لکھ چکی۔ مگر نہ آتے سو نہ جواب دیتے ہو۔  
رات دن آنکھیں دردازے پر لگی رہتی ہیں۔ رات کو آنکھیں نہیں بھپکنیں۔ کتا بھونکا  
اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ بگھی کی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شاید مجھ سے ناراض  
ہو خیر یہاں کسی طرح آ جاؤ۔ تمہاری ناراضگی کا علاج تو میرے پاس ہے۔ اب  
رخصت ہوتی ہوں چراغ کے سامنے نہیں بیٹھا جاتا۔ ایٹھور کرے سو کر تمہارا  
درشن ہو اور یہ خط گھومتا ہوا یہیں آوے

تمہاری برجن

(۹)

پیلے اللہ جی کو خط لکھا اور مجھے نہیں۔ میں نے ایسا کیا تصور کیا تھا۔ خیر  
شکر ہے تم خیریت سے تو ہو۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ اب آنے کے لئے کبھی  
کہو لگی۔ جو کچھ دل پرستیگی سہہ لو لگی۔ کس کے آگے روئے۔ اپنا دیدہ کھوئے۔ لو  
رخصت! بہتر ہے مراد آباد آ جاؤ۔ یہاں تمہارا کون ہے؟

تمہاری برجن

ب۔

## بالکرم اور کلاچرن

پرتاپ چند کو الہ آباد کا دلچسپ پڑھتے تین سال پہلے تھے اس وقت میں  
 اُس نے اپنے بچپن میں اوتا لیفٹننٹ کی محاکمہ میں بہت ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا کالج  
 کی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جہاں اُس کے کمالاتِ قدردانی کا سہرا نہ بہتا تو  
 پروفیسر پرنسپل تھے اور طلباء اُسے اپنا رہنما سمجھتے جس طرح کھیل کے میدان میں اُس کا  
 دستِ انجمن نمایاں تھا اسی طرح لیگ جوڑم میں اُس کی قابلیت اور نکتہ رسی مسلط تھی کالج  
 کے متعلق ایک غائبِ جنم جناب قائم کی کئی تھی شہر کے علم و ستِ رؤسا کا دلچسپ  
 اور طلبا سب اُس کے ممبر تھے پرتاپ اس جنم کا ماہِ درخشاں تھا یہاں ملکی مدنی  
 مسائل پر مباحثے ہوا کرتے تھے اور پرتاپ کی تقریریں ایسی ہندو راقدل ہوتیں کہ پرنسپل  
 کو بھی اُسکی وسعتِ تحقیقات اور تلاشِ برحیت ہوئی اُسکی تقریر اور تحریر دونوں ہی  
 جادو تھا جس وقت وہ اپنا سا دلہا پہنچے ہوئے پلیٹ فارم پر جاتا تو حاضرین کی آنکھیں  
 اُسکی طرف اٹھ اٹھاتیں اور دلوں میں گدگدی ہونے لگتی اُس کا اندازِ تقریر اُس کے اشارے  
 اس کے لبِ لہجہ اُس کے اعضا کی حرکت بھی ایسے مؤثر تھے کہ اُسکی تقریریں گویا قدرتی اثر  
 بھر دیلے جیسے پلیٹ فارم پر ہوتا حاضرین پر ایک سحر کا عالم ہوتا۔ مہربان کے  
 لغو بار بار بلند ہوتے اُس کا ایک ایک فقرہ دل میں چمکے جاتا اور زبان سے  
 بے اختیار واہ واہ کا شور بلند ہوتا۔ اسی خیال سے اُسکی تقریریں عموماً اختتام کو

ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ زیادہ تر شرکاء انجمن صرف اُس کی گرم زبانوں کا ٹھٹھکاٹے  
 کیلئے آیا کرتے تھے۔ اُسکے الفاظ اور انداز میں خدا داد اثر تھا جو قوتِ کرب سے بہت  
 ہے۔ ادب و تاریخ اُسکے تحقیقات اور مطالعہ کے خاص صیغے تھے۔ قوموں کے عروج اور  
 زوال اور اُسکے اسبابِ حالات پر وہ اکثر تقریریں کرتا۔ اس وقت اس کے ان جگر کا دیوں  
 کے حرکتِ زیادہ تر حاضرین کے ذمہ ہلے تھیں۔ وہ کہتے تھے: "وہ نہیں کوہِ اپنی عزت کا کافی  
 بدل سمجھتا تھا۔ ہاں اُسکے مذاق کی یہ دشاں کھینچ کر البتہ قیاس لیا جاسکتا تھا کہ یہ ہونہار  
 بردار اُسکے چلکر کیسے پھل پھول لائے گا اور کیسے رندِ دُپ نکالے گا۔ ابھی تک اُس نے ایک لمحہ  
 بھر بھی غور نہیں کیا تھا کہ میری آئندہ زندگی کی کیا صورت ہوگی۔ کبھی سوچتا پر دنیہ پر خفاؤں کا  
 اور خوب کتابیں لکھنے لگا کبھی وکالت کی طرف سنبال دے دیتا۔ کبھی سوچتا کاش وطنِ ہند  
 جلے تو رسولِ سرور کی تبادی کروں کسی ایک طرف خیال نہ جیتا تھا۔

مگر پرتاب چند اُن طلباء میں سے تھا جسکی تمام کہ منشیوں میں جیسے اور کتابوں ہی  
 تک محدود رہتی ہیں۔ اُسکے وقت اور لیاقت کا ایک قلیل حصہ وفادارِ عام کے کاموں میں  
 بھی صرف ہوتا تھا۔ اس نے خلقتاً ایک ہمدرد اور غریب پر درخشاں پایا تھا اور عوام میں  
 ملنے جلنے اور کام کرنے کی لیاقت اُسے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ انہیں مشاغل میں  
 اُسکی توجہ اور سرگرمی پورے جوش کے ساتھ ظاہر ہوتی۔ اکثر شام کے وقت وہ کیٹ گنج  
 کمرہ کی متعفن گلیوں کی خاک بھانتہ دکھائی دیتا جہاں زیادہ تر بچی ذاتیں آباد ہیں  
 اُسکی عادت ان حصوں میں بہت مانوس تھی۔ جنہ لوگوں کے سایہ سے اونچی ذات  
 کا ہندو دور بھاگتا ہے اُن کے ساتھ پرتاب ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھ کر گھنٹوں باتیں  
 کرتا اور یہی وجہ تھی کہ ان محلوں کے بسنے والے اُس پر فدا ہونیکو تیار تھے۔ نجات اور

عیش پرستی یہ دُعیوب پر تپ چند میں نام کہ بھی نہ تھے۔ کوئی بیکس آدمی ہو پرتاپ اسکی  
دستگیری کس لئے تیار تھا۔ کوئی بیکس مرلین ہو پرتاپ اسکا سچا غمنخوار اور تیار دار تھا۔  
کتنی راتیں اُس نے چھوڑوں میں کر لہتے ہوئے مرلینوں کے سر ہانے کھڑے رہ کر کافی  
تھیں۔ اسی غرض سے اُس نے رفہ عالم کی ایک بھ قائم کر رکھی تھی اور دھانی سالک  
مستمر نہ لے پیر ہر ایک میں نے جتنی کا گزری ہے پہلک کی سیوا کی تھی۔ اُس نے الہ آبادیوں  
کی محدودی اس ٹرنٹ نزع کر دی تھی پرتاپ سر انجن کارٹر روں تھا پچھلے دو  
سالوں سے اس نے طے کر لے۔ ان میں بھی جبکہ لوگ اپنے چوپیدوں کو بچھوڑے۔ ایک تہی جان  
مہتمم پر تھا۔ اس نے یہ ساری باتیں لکھ کر ماریج کر دیا تھا۔

کئی چوں حسبِ تہ ادا کیا۔ انہوں نے پہلے چند نے اسکی بڑی آف جاکت کی مرور  
یا مہلت کی۔ جس میں اس نے خود سے جس وقت وہ چرن کی بیماری کی خبر پا کر  
بازار میں اس کے واسطے ملے تھے۔ یہ تھا کہ چرن کو جانتے پہچانتے ہی اس وقت سے  
پرتاپ کو پتہ چلا کہ یہ پرتاپ سے اس کے دلیدہ و جید نہیں پرتی جو میرے لئے  
مضمون ہے۔ یہاں مسرہ شعلہ نہ رہے کیلئے کافی تھا۔ غلام اس کے لئے اکثر یہ خیال  
بھی کرتا تھا کہ یہ پرتاپ کا قاتل ہوں۔ میری ہی بدنہ پانیں اس غریب کی  
جانی کا کلام نہیں کرتے۔ جبکہ سو میلانے مرلے وقت اس سے بدو کر لینے  
خطہ دل کے مافی۔ نگہی تھی پرتاپ نے ولسن ارادہ کر لیا تھا کہ موقع ملا تو اس ماس گنگہ  
کی ملازم ضرور کر دینگا۔ کلاچرن کی ضرور مدارت اور تعلیم و تربیت میں اُسے کسی حد  
تک پیر الیشپٹ۔ کہ پورے کمرے کا اندر موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ علم و شعور میں کلاچرن  
سے منزلوں آگے تھا مگر اُس سے یوں پیش آتا تھا جیسے چھوٹا بھائی بہنو بھائی کے ساتھ۔

اپنے وقت کا کچھ حصہ اسکی مدد کرنے میں صرف کرتا اور ایسی سہولتیں اتالیق کا فرض ادا کرتا کہ تعلیم ایک دلچسپ مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتی۔

مگر پرتاپ چند کی ان کوششوں کے باوجود مکملہ چرن کی طبیعت یہاں بہت گھبراتی رہی۔ بورڈنگ ہاؤس میں اس کے مذاق کا ایک آدمی بھی نہ تھا۔ جس سے وہ اپنا درد دل کہتا اور اپنے زخم جگہ پر مرہم رکھواتا۔ فیہار باش، بیفکر، نگین، مزاج آدمی تھا جس نے آج کے سواکل کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پرتاپ باوجود پتے بھٹی کے و دل کی بہت سی باتیں کہہ سکتا تھا جب اکیلے پن سے طبیعت بہت اکتاتی تو چرن کو کوٹنے لگتا کہ میرے سر پر مصیبتیں کیسی لگتی ہوتی ہیں اسے مجھ سے کس نہیں زبان اور قلم کی محبت بھی کوئی محبت ہے وہ محبت ہی کیا موقع اور صحت کی آواز دے دیتا ہے۔ لگے میں چاہے ان پر جان ہی کیوں نہ دیوں مگر انکی محبت نہ ان اور قلم کے درمیان سے باہر نہ نکلی۔ ایسے ہی کہ وہ بوجھنا جانتا ہی ہو اور ٹپکنے سے کیا حال۔ ان خیالات سے بہت تنہا اور کڑا کر اسے چرن کو خط لکھنا چھوڑ دیا۔ بیجاری اپنے خطوط میں کلمہ نکال کر رکھتی مگر مکالمات جواب نکالتا اور دینا بھی تو خفک و دشمن۔ اس وقت چرن کی ایک ایک بات، اسکی ایک ایک حرکت اسکی سر دھڑکی کا پتہ دیتے تھے معلوم ہوتی تھی۔ ہاں اگر یاد نہ آتی تھیں تو چرن کی خاطر داریاں اور دوسو زیاں۔ وہ نشانی آنکھیں جم اس سے کھدھارتے وقت ڈیڑھ یا گیس تھیں اور نازک نازک ہاتھ جنہیں نے باہم مکر اس سے شیش کی تھیں کہ خط برابر بھیجتے رہنا۔ اسے پلوا آ جاتے تو ممکن تھا کہ اسے کچھ تسکین ہوئی مگر ایسے موقعوں پر انسان کا حافظہ دھوکا دینا کرتا ہے۔

آخر مکملہ چرن نے اپنی تنہائی کا ایک مشغلہ سوچ ہی نکالا جسبوقت سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس وقت سے بازار حسن کی سیر شروع کی جس پرستی اس کا خمیر ہو گئی تھی اور اس قسم

کوئی نہ کوئی مشغلہ اس کیلئے ایسا ہی ضروری تھا جیسے بدن کیلئے غذا۔ بورڈنگ ہاؤس سے ملا تھا ایک سیٹھ کا باغیچہ تھا اور اُس کے رکھ رکھاؤ کیلئے ایک نالی نوکر تھا۔ اس نالی کے ایک دیشہ لڑکی سر جو دی تھی۔ اگرچہ بہت حسین نہ تھی مگر کلا حسن کا تین طلبہ گار نہ تھا۔ جتنا کسی دلہن کی کے مشغلہ کا۔ کوئی عورت جبکہ چہرہ پر شباب کی جھلک ہو اُس کا دل بہلاسنے کے لئے موزوں تھی کلا اس لڑکی پر ڈولے ڈالتے شام سویرے بلا ناہم چمن کی روشنی میں اُٹھتے نظر آتا اور اُس کے نو میدان میں ورزش کرتے مگر کلا چون باغیچہ میں اگر تاک جھانک میں مصروف رہتا۔ رفتہ رفتہ اُس نے سر جو دی سے شناسائی۔ ہمدردی اور پھر محبت پیدا کر لی۔ وہ اس سے بچہ مولیت اور نقد قیمت کے علاوہ چھگنے دام دیتا۔ مال کو تہوار کے موقع پر سب سے زیادہ تہواری کلا چون ہی سے ملتی یہاں تک کہ سر جو دی اُس کے دام الفت کی اسیر ہو گئی اور دو ایک بار تاریکی کے پردہ میں باہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا سب طلبہ سیر کو گئے ہوئے تھے کلا کیسیلا باغیچہ میں ٹہرتا تھا اور وہ رہ کر مالی کے چھوٹے کی طرف جھانکتا تھا۔ بیکو یک بھجڑ پڑے ہیں۔ سر جو دی نے اُسے اشارہ سے بلایا اور کلا بڑی تیزی سے اندر گھس گیا۔ سچ سر جو دی نے ملل کی ساڑھی پہنی تھی جو کلا بابو کا تحفہ تھا۔ سر میں خوشبو داتیل ڈالا تھا جو کلا بابو بانڈا سے لائے تھے اور ایک چھیلے کا سلوکا پہنے ہوئے تھے جو انہیں بالہ صاحب نے نبھادیا تھا۔ یہ سب کلا بابو کی خاطر تھی۔ اپنی طرف سے سر جو دی نے صرف آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ آج وہ اپنی نگاہ میں بہت حسین معلوم ہوتی تھی۔ ورنہ کلا جیسا امیر اور حسین آدمی کیوں اس پر جان دیتا۔ کلا کھٹو لے پر بیٹھا ہوا سر جو دی کی لادوں

کہستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اُسوقت سر جو دہی ہرج رانی سے کسی طرح کم حسین نہیں نظر آتی تھی۔ رنگت میں ذرا سا فرق تھا مگر یہ کئی ایسا بڑا فرق نہیں اُسکی نگاہ میں سر جو دہی کی محبت سچی اور تھوڑا پرجوش معلوم ہوتی تھی کیونکہ وجہ کبھی بنارس جانا نہ کہہ کر تا تو سر جو دہی ملال نہ دلوانے لگتی اور کہتی کہ مجھے جس لیے جلتے میں مہرہ اساتھ نہ چھوڑ دینی۔ کہاں یہ محبت کی گرمی اور غنیمت کا زور اور کہاں برجن کی غیم ملانے خاطر حاسیاں اور ہر جمانہ مسلمات آمیزیاں۔

کھلا بھی اچھی طرح آنکھوں کو سلینے بھی نہ پایا تھا کہ یہ یکہ لالے دروازہ اگر کھٹکھٹایا۔ اب تو کاؤتہ بن میں لہو نہیں یہ چہرہ کارنگ۔ اُٹ گیا۔ سر جو دہی سے کہہ کر کہہ کر بولے۔ ”میں کہاں جاؤں“ سر جو دہی کے آپ ہی ہوشیار سے ہوتے تھے۔ ”تھوڑا سیس زبان سے کچھ بات نہ کیجی“ اتنے میں ہی نے پھر زنجیر کھٹکھٹائی چاروں مرتبہ دہی بے بس تھی۔ اس نے دھتے دھتے ایک کواڑ کھول دیا۔ سماں چرن آگ کو تے میں نہایت کر کھڑا ہو گیا۔

جس طرح بھینٹ کا بابا اکٹار کے تیلے تڑپتا ہے اسی طرح کوئلے میں کھٹکھٹانے والے کھلا کا دل اسوقت تڑپ رہا تھا وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا البتہ ایشور کو صدق دل سے یاد کر کے کہہ رہا تھا کہ اگر ابلیس مصیبت سے رہا ہو جاؤں تو پھر بھی اسی حرکت کریں گا۔ اتنے میں مالی کی نگاہ حضرت پر پڑی۔ پہلے تو کچھ گھبرایا پھر نزدیک آکر لہلا۔

”یہ کون کھڑا ہے۔ یہاں کون ہے؟“

اتنا سننا تھا کہ کھلا چرن تیزی سے ہاتھ نکلا اور پھاٹک کی طرف بگڑ بھاگا مالی ایک منڈا ہاتھ میں لئے دینا لینا بھاگنے نہ پاؤں کے نعرے مارتا پچھ پیچھے دوڑا۔

یہ وہی کھلا ہے جو مالی کو انعام و اکرام دیا کرتا تھا اور جس سے مالی سرکار اور حصہ کو تیار کرتا تھا وہ کھلا آج اسی مالی کے سامنے اس طرح جان بچا کر بھاگا جاتا ہے۔ گناہ کا یہ وہ گنہگار جو عورت و حرمت جو صلہ و ہمت کو دم زدوں میں جلا کر رکھ کر دیتا ہے۔

کھلا چلن و خصلت اور بھاریوں کی آرٹ میں ڈرتا ہوا بچا ایک سببان ہر کھلا۔ سرک پر ٹریم جابری بھی اس پر جا بیٹھا اور ہانپنے پانپنے پیسہ ہو کر گاڑی کے تختہ پر بڑھ کر پڑا۔ اگرچہ مالی نے پھاٹک تک بھی بھیجنا نہ کیا مگر کھلا ہر ایک آنے جانے والے پر جو کچھ دیکھتا تھا وہیں ڈالتا گویا سارا زمانہ اُس کا آئینہ ہو گیا ہے۔ کبھی نے ایک درگل کھلایا۔ پیش پر پہنچے ہی پھاٹک کا مارا ریل گاڑی میں جا کر بیٹھ تو گیا مگر ٹکٹ لینے کی سندھری اور نہ دھرم ہو کر کہہ رہا ہوں۔ وہ اس وقت اس شہر سے بھاگتا جا رہا تھا۔ خواہ کہیں ہو۔ کچھ دیر چلا تھا کہ ایک نگارین کیلئے انٹرکسٹیں لے آتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک کنسٹبل بھی تھا۔ وہ مسافروں کا ٹکٹ دیکھتا چلا آتا تھا۔ مگر کھلا نے سمجھا تو امیس کا کوئی آفسر جو ریلوے کے مارے ہاتھ پاؤں بندھنے لگا اور کھجیہ میں دھڑکن ہونے لگی۔ جب تک کہ دوسری گاڑیوں میں ممانہ کرتا رہا تب تک وہ کھجیہ مضبوط کئے بیٹھا رہا۔ مگر جب ہی اُس کے کہہ کا دواڑہ کھلا کھلا کے پانچو پانچو پھول گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک حشر نے یہ عالم دیکھ کر کہ وہ کادروانہ کو لکر رہتی ہوئی ریل پر سے نیچے کود پڑا۔ کھلا بلی اور ٹکٹ والے سے حسب آئے اُسے یوں کودتے دیکھ کر تو سمجھے کوئی مسافر ڈاکو ہے۔ مارے خوشی کے چھوٹے نہ مہلتا کہ انعام الگ لیر گا اور ترقی اور پر سے ہرگز فوراً سرخ لالین کھائی۔ دراز میں گاڑی کی گھر اب گاڑی اور کنسٹبل اور ٹکٹ والے صاحب مع چند دسر آدمیوں کے گاڑی سے اتر پڑے۔



اولائین لے لے کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگے۔ کسی نے کہا اب اس کا گرد بھی نہیں  
 ملے گا۔ پکا دمکیت تھا۔ کوئی بولان لوگوں کو کالی جی کا الٹنٹ رہتا ہے جو کچھ کر دکھائیں  
 تھوڑا ہے۔ مگر کاڑا آگے جا بڑھتا گیا۔ ترقی کی امید اُسے آگے لئے جاتی تھی یہاں تک  
 کہ اس مقام پر پہنچا جہاں مکلا گاڑی سے کودا تھا۔ اتنے میں کنسٹیبل نے خندق  
 کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دیکھو وہ سفید سفید چیز کیا ہے۔ مجھے تو کوئی آدمی معلوم  
 ہوتا ہے اور لوگوں نے بھی دیکھا اور یقین ہو گیا کہ ضرور یہی بد معاش یہاں چھپا ہوا  
 ہے چلکر بچہ کو گھیر لو کہ کہیں نکلنے نہ پاوے۔ ذرا سنبھلے ہوئے رہنا۔ ڈاکو جان پر  
 کھیل جاتے ہیں۔ گاڑی صاحب نے پستول منبھالا۔ میاں کنسٹیبل نے لاٹھی تانی۔  
 چند مسافروں نے جوتے اتار اتار کر لم تقول میں لئے کہ کہیں وار نہ کر بیٹھا تو بھاگنے میں  
 آسانی ہوگی۔ دوپہار آدمیوں نے ڈھیلے اٹھائے کہ دور ہی سے نشانہ لگائیں گے۔  
 ڈاکو کے نزدیک کون چلے۔ کسے جان بھاری پڑی ہے۔ مگر جب لوگوں نے  
 نزدیک جا کر دیکھا تو نہ ڈاکو نہ ڈاکو کا بھائی بلکہ ایک شریف صورت، مسرور آغاز  
 چہرہ پر بے بدن کا فوجان بے حس و حرکت زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے اور اس کی  
 ناک اور کان سے آہستہ آہستہ خون بہہ رہا ہے۔ برجن کالال۔ سر جو دی نے چھین کر  
 زمین پر پٹک دیا۔ مکلا نے ادھر دم توڑا اور برجن ایک بھیاں تک خواب دیکھ کر چونک  
 پڑی۔ سر جو دی نے برجن کا سہاگ لوٹ لیا۔ شہ اب محبت کا دور ایسا بند  
 ہوا کہ نہ ساتی رہا نہ ساغر۔ سب خاک میں مل گئے۔

## بہجومِ غم

سہباگن عورت کے لئے اُس کا شوہر دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے وہ اُسی لئے بھلتی ہے اور اُسی کے لئے مرنے لگتی ہے۔ اُس کا ہنسنا بولنا اُسی کو خوش کرنے کے لئے اور اُس کا بناؤ سنگار اُسی کے بھٹکے لئے ہوتا ہے۔ اُس کا سہباگ اُسکی مسرت اور زندگی ہے اور سہباگ کا اُٹھ جانا اُسکی زندگی اور جاں نثاری کا خاتمہ۔

کھلا چرن کی بے ہنگام موت برجِ رانی کے لئے موت ہے کہ نہ تھی۔ اُس کی زندگی کی آرزوئیں اور دلوں سے سب مٹی میں مل گئے۔ کیا کیا ارادے تھے اور کیا ہونگیا۔ ہر دم مرنے والے کی صورت اُسکی آنکھوں میں پھر اُڑتی تھی۔ اگر ذرا دیر کیسے آنکھیں جھپک جاتیں تو اُسکی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔

بعض اوقات آفاتِ ارضی و سماوی کو کسی خاص شخص یا جاندار سے اُنس سا ہو جاتا ہے کھلا چرن کا داغ مڑھالے بھی نہ پایا تھا کہ بالوشیا ماچرن کی باری آگیا تھی۔ شاخوں کے کاٹنے سے بد رخت کو مڑھالے دیکھ کر انکی آسمان نے جڑ ہی کاٹ دی۔ رابین پانڈے بڑا لکیمہ و شخص تھا جب تک ڈپٹی صاحب جج گاؤں میں تھے دبا کا بیٹھا ہر گرجوں ہی وہ شہر کو لوٹے اسی دن سے اُس نے اذہم مچانا شروع کر دیا سارا گاؤں کا گاؤں اُس کا دشمن تھا۔ جن نگاہوں سے جج گاؤں والوں نے بولی کے دن اسکی طرف دیکھا تھا وہ نگاہیں اور تیز اُسکے کلیجوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے جس حلقہ میں جج گاؤں

واقعہ تھا اس کے تھانہ دار صاحب ایک بڑے گھاگ۔ آرمودہ کار رانی تھے۔ ہزاروں کی رقیں مضم کر جالیں گھوڑ کار تک نہ لیں۔ مقدمے بنانے اور ثبوت پہنچانے میں ایسے مشاق کہ راہ چلتے آدمی کو پھانسن دیں اور پھر کسی کے ٹھہرائے نہ چھوڑے۔ حکام سب ان کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے مگر اعلیٰ ہوشیاری اور معاملہ دانی کے مقابلہ میں کسی کا کچھ نہیں چلتا تھا۔ راجدین ان تھانہ دار صاحب سے ملتا اور اپنے زخم جگر کی دوا مانگی۔ اس کے ہفتہ بھر بعد جگہ گاؤں میں ڈاکہ بڑ گیا۔ ایک مہاجن شہر سے آتا تھا۔ مگر کوئیر دا کے یہاں ٹھہرا۔ ڈاکوؤں نے اسے لوٹ کر گھر نہ جانے دیا۔ صبح کو تھانہ دار صاحب تحقیقات کو آئے اور ایک ہی رتی میں سارے گاؤں کو پانسلے گئے۔

حسن اتفاق سے مقدمہ بالوشیا مایہرل کے اجلاس میں پیش ہوا انہیں پہلی سے سارا کچھ معلوم تھا اور یہ تھانہ دار صاحب بہت دنوں سے اعلیٰ آئندوں پر چڑھ ہوئے تھے انہوں نے ایسی ایسی دوش کا خیال کیا اور ایسے ایسے نکتے نکالے کہ تھانہ دار صاحب کی قطع کھائی گئی۔ چہ چہیں اب مقدمہ تپلا اور دھوم سے چلا۔ سرکاری وکیلوں نے بڑے بڑے سند رکالے۔ مگر گھر کے بھیدی نے کیا چھپ سکتا تھا یہ بڑا گزرتی تھا صاحب سب مڑوں کو بے داغ رہا کر دیا اور اسی دن تمام کو تھانہ دار صاحب محفل کر دئے گئے۔

جب ڈپٹی صاحب فیصلہ سن کر بوٹے تو ایک جملہ دالہا کاٹنے لگا۔ تھانہ دار صاحب نے دانا ہوشیار نہیں کیا آج بہت بھٹلایا ہوا تھا۔ پہلے بھی دو تین افسروں کو لٹے پر کاہے آپ پر بھی ضرور ڈاکہ لگا۔ ڈپٹی صاحب نے سنا اور مسکرا کر آدمی کا شکریہ ادا کیا مگر اپنی حفاظت کے لئے مزید انتظام نہ کر سکے۔ انہیں یہ بُردا

خیال معلوم ہوتا تھا۔ رادھا امیر بہت ضد کرتا رہا کہ میں آپ کے ساتھ رہو گا۔ کاشی پھر بھی بہت پیچھے پڑا رہا مگر انہوں نے کسی کو ساتھ نہ رکھا اور حسبِ عمل پناہ فرمایا۔ اُدھر یہ ظالم خاں بات کلاہنی عقادہ زندگی سے ہاتھ دھو کر بابو شیا ماحرن کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک روز وہ سیر کر کے شیوپور سے کچھ بات کئے واپس آئے تھے کہ پاگلخانہ کے قریب کچھ دیکھ کر فٹن کا گھوڑا بدکا۔ گاڑی رُک گئی اور دمِ زندں میں ظالم خاں نے ایک درخت کی آڑ سے نکھکھکستعل کا نشانہ لگایا پٹا خے کی آواز ہوئی اور بابو شیا ماحرن کے سینے سے گولی باگ ہو گئی۔ پاگل خانہ کے گارد کے سپاہی ددڑے اور ظالم خاں کو گرفتار کر لیا سائیس نے اُسے بھل گئے نہ دیا تھا۔

اس حادثے نے خاندان کی تباہی کا سامان پُورا کر دیا۔ پرمیٹی یوں تو بہت نیک مزاج اور محبتی عورت تھی مگر ان حادثات نے اُس کے مزاج اور برتاؤ میں یکایک بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کے حواس میں فرق آ گیا۔ بات بات پر برجن سے چرچا جاتی اور طعنے مارنے لگتی۔ اُسے خدا جانے کیونکر وہم ہو گیا تھا کہ یہ سب آفت اسی بہو کی لائی ہوئی ہے۔ یہی سبز قدم جب سے گھر میں مائی گھر ستیا ناس ہو گیا۔ اس کا پوتا خراب ہے۔ کئی دفعہ اس نے کھول کر برجن سے کہہ بھی دیا تھا کہ تمہاری چکنی مٹوٹ نے مجھے مہلایا۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے حرن ایسے منحوس ہیں۔ برجن یہ باتیں سنتی اور کلیجہ میل کر دیتی۔ جب یہاں ہی بُرے آگئے تو بھلی باتیں کہہ کر سُنے میں آئیں۔ اُسے آٹھوں پہر کی کوفت اُسے سرسرت آسنو بھی نہ پہنا دیتی۔ آسنو نکلتے ہیں جب کوئی ہمدرد ہمارا درلسوزی کرے۔ کوفت اور لعن طعن کی آگ سے آسنو خشک ہو جاتا ہے ایک روز برجن کا جی گھر میں بیٹے بیٹے ایسا گھبرا کہ وہ ذرا دیر کیلئے باغیچہ میں

چلی آئی۔ آہ اس باغچہ میں کیسے کیسے لطف کے دن گزرتے تھے۔ اس کا ایک ایک لمحہ مرنے والے کی محبت بیکہاں کا یادگار تھا۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ان پھولوں اور پتیوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا اور نسیم دل پر غموں کا نشہ پیدا کر دیا کرتی تھی یہی وہ مقام ہے جہاں بہت سی شاہیں آغوش الفت میں گزری تھیں اور جہاں شراب محبت کے دور چلے تھے۔ اس وقت پھولوں کی پیکر طراں اپنے نازک نازک ہونچھول سے اس کا خیر مقدم کرتی تھیں۔ مگر افسوس! آج ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور زبانیں بند تھیں کیا یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں البیلی مالن پھول کا ہار گوندھتی تھی مگر پھول کو کیا معلوم تھا کہ اسی جگہ اُسے اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے موتیوں کے ہار گوندھنے پڑیں گے انہیں خیالوں میں برج کی نگاہیں اس کچ کی طرف کھائیں جہاں سے ایک بار کلاچر مسکراتا ہوا نکلا ہوا تھا۔ گویا وہ پتیوں کی جنبش اور اُسکے کپڑوں کی جھلکے کچ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ہلکی سی مسکراہٹ نمودار تھی جیسے گنگا میں گہترے ہوئے آفتاب کی زرد اور ولین کرپوں کا عکس پڑتا ہے۔ یکایک پرہیوتی نے آکر کرخت آواز میں کہا: ”اب آپ کو سیر کرنے کا شوق چڑایا ہے؟“

برج کی کھڑی ہو گئی اور روتے ہوئے بولی: ”اے امل! مجھے نارائن نے بچلا اُسے آپ کیا چاہتی ہیں؟“

آخر پوچھنی تشر سے ایسی بنیاد ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر سب سالانہ اونچے نیچے کر عجگاؤں چلی گئی۔ برج رانی کو ساتھ نہ لیا۔ اُسکی صورت اُسے نفرت ہو گئی تھی برج اس وسیع مکان میں اکیلی رہ گئی، مادھوی کے سوا اہل سرائی کوئی غمخوار نہ تھا سب امل کو اپنی منہ بولی بیٹی کی مصیبتوں کا اتنا ہی صدمہ ہوا جتنا اپنی بیٹی کا ہوتا۔ کئی دن

تک روتی رہی۔ اور کئی دن برابر اسے سمجھانے کے لئے آتی رہی۔ جب بچہ اکیلا رہ گیا تو بھانسانے چاہا کہ یہ میرے یہاں اٹھ آئے اور آرام سے رہے۔ خود کئی بار بلانے لگی۔ مستری جی کو بھیجا مگر بچہ کسی طرح آنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اسے نیل ہوتا تھا کہ کسیر کو دنیا سے سدھالے۔ ابھی تین مہینہ بھی نہ ہوا اتنی جلدی ممکن خالی ہو جائیگا تو لوگ کہیں گے کہ اُنکے مرتے ہی ساس اور بہو لڑ میں۔ یہاں تک کہ اُسکی اس غصہ سے بھانا کامن مونا ہو گیا۔

بچہ گاؤں میں پریمیوتی نے ایک ندھیر مچا رکھا تھا۔ اسامیوں کو سخت شست کتی کارندہ کے سر پر جوتی پنکدی پٹلی کو کوسا۔ رادھا امیر کی لگے زبردستی لے لی یہاں تک کہ گاؤں والے کھیر لگے اور بالورادھا چرن سے شکایت کی۔ رادھا چرن نے کیفیت سنی تو یقین ہو گیا کہ ضرور ان صدا سے اس کے حواس زائل کر دئے ہیں۔ اسوقت کسی طرح ان کا دل بہانا چاہیے۔ سیوتی کو لکھا کہ تم آؤں کہ پاس چلی آؤ اور اس کے ساتھ کچھ دنوں رہو۔ سیوتی کی گود میں اسوقت ایک چاند سا بچہ پھیل رہا تھا اور پران تھا۔ دو مہینہ کی زحمت لیکر درجہ تک سے لائے تھے۔ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو گئے تھے۔ ایسے موقع پر سیوتی کیونکر آ سکتی۔ تیاریاں کرتے کرتے مہینوں گزر گئے۔ کبھی راجا بیمار پڑ گیا کبھی ساس روٹھ گئی۔ کبھی ساعت نہ بنی۔ آخر چھ دنوں مہینہ جا کے اسے فرصت ملی اور وہ بھی بڑی فلتوں کے ساتھ

مگر پریمیوتی پر اس کے آنیکا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس کے گلے ملکر بھی نہ روتی اس کے بچے کی طرف نہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے دل میں اب محبت اور انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ جیسے گئے سے دس نکھل لو تو صرف فضلہ رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح جس انسان

کے دل سے محبت نہ کر گئی، گوشت و پوست کا ایک توڑ بگیا۔ دیوی دیوتا کا نام زبان بجاتے ہی اُسکے تیو سبیل جلتے تھے۔ جھگاڑوں میں جہنما شمشی ہوئی۔ لوگ ٹھاکر جی کا برت رکھے رہتے تھے اور چند سے ناچ کر اُسکی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر پریمی نے عین جہنم کے موقع پر اپنے گھر کی مورتی کھیت میں پھینکوا دی۔ ایکادشی برت چھوڑا دیوتاؤں کی پوجا بھولی۔ ڈپریمیٹی اب پریمی ہی نہ تھی۔

سیوتی نے جوں توں کہے یہاں دو مہینہ۔ طار۔ اُسکی طبیعت بہت گھبراتی۔ کوئی سکھی مہلی بھی نہ تھی جسکے ساتھ بیٹھ کر دن بکاٹتی۔ برہن نے تسکا کو اپنی سکھی بنا لیا تھا۔ مگر سیوتی کا مزاج امیرانہ واقع ہوا تھا۔ ایسی عورت سے میل جول وہ اپنے لئے ہرگز ننگ سمجھتی تھی۔ تسکا سا بیچاری کئی بار آئی مگر جب بے نیہ گریہ دل کھول کر نہیں ملتی تو توتا جانا چھوڑ دیا۔

میں مہینہ گزر چکے تھے۔ ایک وزسیوتی دن چڑھے تک سوئی رہی۔ پران ناٹھ نے رات کو بہت رُلایا تھا جب نیند کھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ پریمیٹی اس کے پیچے کو گور میں لئے چوم رہی ہے۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی ہے اور کبھی پھانی سے چٹکتی ہے۔ سانسے انگلیٹی پر پٹیا پاک رہا ہے۔ پچھ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے اچا متبے کہہ کر ٹوٹے میں جا بیٹھوں اور گرم گرم جلوں بکھول۔ آج اس کا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا ہے شاید اُسکی تیز نگاہوں نے تاڑ لیا ہے کہ پریمیٹی کے اُجڑے ہوئے دل میں پریم نے آج پھر باک کیا ہے۔ سیوتی کو یقین نہ آیا۔ چارپائی پر پڑے پڑے نیم باز آنکھوں سے تاک ہی تھی گویا خواب کھڑی ہے اتنے میں پریمیٹی پیار سے بولی۔ بیٹی اٹھو دن چڑھ آیا۔

سیوتی کے رونے کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بھرا ئیں۔ آج بہت دنوں کے

بھال کے منہ سے محبت کی باتیں سنیں۔ جھٹ اٹھ بیٹی اماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی۔ پریمی کی آنکھوں سے بھی آنسو کی جھری لگ گئی۔ سوکھا پیر ہوا۔ جب دونوں کے آنسو بھٹکے تو پریمی بولی ”سنو۔ تمہیں آج یہ سب باتیں اچرج معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں بیٹی اب اچرج ہی ہیں۔ میں کیسے فعل جب آنکھوں میں آنسو ہی نہیں رہے پیار کہاں سے لاؤں جب کچھ سمجھ کے پھر سو گیا۔ سب دنوں کے پھر ہیں۔ آنسو ان کے ساتھ گئے اور پیار کمر کے ساتھ۔ آج نہ جانے یہ دو بوند کہاں سے نکل آئے۔ بیٹی میری سناٹا میں سب معاف کرنا۔“

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ سیوٹی زرد ہو گئی۔ ماں کو فرش پر لٹایا۔ اس نے پریمی کا یہ حال دیکھا جب تکچھو رہی ہے۔ باتیں کرتی تو شکر و شکر گھولتی۔ بچے کو گود سے ایدم کے لئے الگ کرتی۔ مہروں سے بولی تو مہنہ سے پھول بھرتے پھر ہلکی برمیوت ہو گئی۔ شیریں زباں۔ رحم دل اور نیک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل پر سے ایک پردہ سا اٹھ گیا جب شدت کی برف پڑتی ہے تو بعض ندیاں رخ بستہ ہو جاتی ہیں۔ تب ان میں بسنے والی مچھلیاں اور دریائی جانور چادر برف میں چھپ جاتے ہیں کشتیاں چنسن جاتی ہیں اور اس خوش خرام سمیٹن جاں نواز چشمہ آب کی صورت بالکل نظر نہیں آتی۔ حالانکہ برف کی چادر کے نیچے وہ خوابِ ناز میں مست پڑا رہتا ہے مگر جب گرمی کا راج ہوتا ہے تو برف بچھل جاتی ہے اور دریا سے سمیٹن برف کی حیدر اٹھ اڑتا ہے پھر مچھلیاں اور جانور آتے ہیں۔ کشتیوں کے بادبان لہرانے لگتے ہیں اور اس کے ساحل پر موم و مرغ و مور کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں پریمی کی جان نالاک



ہلکی مزاج کا صبح ہونا گویا موت کا پروانہ تھا۔ اسی مدہوشی نے اسے ایشک قیصرِ حیات میں رکھا تھا۔ ورنہ پریمیوں جیسی نرم دل عورت بابرِ حادثہ کے ایسے جھونکے نہ بن سکتی۔

سیوتی نے چاروں طرف تارِ دلولے کہ اکراماں کو دیکھ جاؤ۔ مگر کہیں سے کوئی نہ آیا۔ پران ناٹھ کو رخصت نہ ملی۔ برجن بیمار تھی۔ رہے مادھا چرن وہ نینی تال سمیر کرنے گئے ہوئے تھے۔ پریمیوں کو بیٹھے ہی کے دیدار کا اشتیاق تھا۔ مگر حجب اُن کا خط آگیا کہ میں اس وقت نہیں آ سکتا۔ تو اس نے ایک لمبی سائنس لی او اُنکھیں موند لیں اور ایسی سوتی کہ پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا:

## نفس کی سرکشیاں

السان کا دل ایک بازارِ سرسبز ہے کبھی تودہ لاکھوں کی طرف اٹکھ اٹکھ کر نہیں دیکھتا اور کبھی چند بیسوں پر پھیل جاتا ہے کبھی صد ہائے گنا ہوں کے خونِ پرافت تک نہیں کرتا کبھی ایک بچے کو رو تا دیکھ کر رو دیتا ہے پرتاپ چنداؤ کملہا جرن میں اگرچہ برادرانہ محبت تھی مگر کملہ کی موت بے ہنگام آکا جو صدر پر تپا کو مریا جاسیے وہ نہ ہوا۔ سن کر جو نک ضرور پڑا اور ذرا دیر کے لئے معلوم کیا نظر آیا مگر وہ ملال جو کسی شخص کو اپنے سچے دوست کی وفات پر ہوتا ہے اُسے نہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ شادی سے پہلے ہی سے اس نے جرن کو اپنی بہن سمجھنا شروع کیا تھا۔ تاہم اس خیال میں اسے پوری کامیابی کبھی نہ حاصل ہوئی۔ وقتاً فوقتاً اُس کا وہم اس پاک شے کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتا تھا۔ کملہا جرن سے اُسے نباتِ خودِ خاص کوئی ایسی محبت نہ تھی۔ اُسکی جو کچھ خاطر و مدارات اور محبت کا کرتا تھا کچھ تو اس خیال سے کہ جرن سُکر خوش ہوگی اور کچھ اس خیال سے کہ سوسیلی کی موت کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے جب جرن سسرالِ علی آئی تو اللہ نے کچھ دنوں تک پرتاپ نے اُسے اپنے خیالات میں نہ آنے دیا۔ مگر جب وقت سے کہ اُسکی بیماری کی خبر پراکبر سارس گیا تھا اور اُسکی ملاقات نے جرن پر داروئے شفا کا کام کیا تھا۔ اُس وقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا کہ جرن کے دل میں کملہ نے وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لئے مخصوص تھی۔

پرتاپ نے جرن کو نہایت پروردہ نام نہ لکھا مگر خط لکھتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا

تھا کہ اس کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ بالعموم عدد دی محبت، کو مضبوط کرتی ہے کیا عجیب گریہ  
 خضم ہی اپنا کام کر جائے، غلط اس کے چونکہ دُراندہ ہمت کی طرف زیادہ مائل تھا، مکمل کی  
 موت نے یہ خیال پیدا کیا کہ الٹنور نے میری محبت کی قدر کی اور مکمل چرن کو میرے راستے پہنچا  
 گویا یہ غیب سے پروانہ ملا ہے کہ اب میں برجن سے اپنی محبت کی داد لوں پہ تاپ یہ تو جانتا تھا  
 کہ برجن سے کسی ایسی بات کی امید کرنا حقا خلق اور صداقت کے راستے سے جو بھر بھی ہٹی  
 ہوئی نہ جو حقاقت ہے، مگر اخلاق اور صداقت کے دائرہ میں بہتے ہوئے میری خاطر داری اور  
 دلہی اگر ممکن ہے تو برجن زیادہ عرصہ تک، میرے ساتھ برہمی نہیں کر سکتی۔ جب میں  
 آنکھوں میں آنسو بھر کر ادعا جزئی سے شرت کرونگا تو ضرور میری طرف ملاحظہ ہو جائیگی  
 اور وقت محبت اور عاشقانہ خاطر دایاں اپنا اپنا کام پورا کر کے ہٹے گی۔

ایک ہفتہ تک یہ خیالات اُسے بچپن کہتے ہے یہاں تک کہ برجن سے ایک بار  
 پوشیدہ ملاقات کرنے کا بیٹا بانہ اشتیاق اُسے پیدا ہوا۔ یہ دُجانتا تھا کہ ابھی برجن کے  
 دل پر تازہ صدمہ ہے اور میری بات یا انداز سے اگر میرے نفس کی سرکشوں کی بونگلی  
 تو بھر برجن کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے گر جاؤں گا مگر جیسے کوئی پتھر سے کا ڈھیر دیکھ  
 کر صبر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح پرتا پلے سوخت اپنے تیش تمام نہ سکا۔ انسان کی قیمت  
 ایک بڑی حد تک موت و حیات کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ موقع سے نیک بھی بناتے ہیں اور بد بھی  
 جب تک مکمل چرن نہ تھا پرتا پکے نفس کو کبھی اتنا سراٹھانے کا موقع نہ ملا۔ اس کی  
 موت نے گویا جگہ خالی کر دی۔ یہ خود غرضی کا نشہ یہاں تک بڑھا کہ اُسے ایک دن ایسا لگا  
 ہونے لگا کہ برجن مجھے یاد کر رہی ہے۔ اپنی بیٹائی سے وہ برجن کی بیٹائی کا اندازہ لگنے  
 لگا۔ بنائیں چلنے کا ارادہ مصمم کر لیا۔

و دیکھے مات کا وقت تھا۔ چاروں طرف موت کا سامنا اچھا یا اچھا تھا۔ بنید  
نے سلسلے شہر پر ایک گھٹا ٹوپ چادر پھیلا دی تھی۔ کبھی کبھی پتھلوں کی سنسنی ہنسٹ سنٹی  
دیجاتی تھی۔ دھواں مکانوں اور درختوں پر ایک سیاہ غلاف کی طرح لپٹا ہوا تھا اور شرک  
کی لالینیں دھوئیں کی سیاہی میں ایسی نظر آتی تھیں جیسے بادل میں چھپے ہوئے تارے۔ پرتاپ  
چند میل گاڑی سے تھکا ہوا دل بالسنوں اکھل رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں کلپنے لگے۔ یہ  
زندگی میں پہلا موقع تھا کہ گناہ کا اُسے تجربہ ہوا۔ افسوس! کہ دل کی برکفیت شرمہ تک  
قابل نہیں ہوتی نصراہ منزل دشتار کو طے کر لیتا ہے۔ بہرے تک بھی شراب نہیں پی آتے  
اُس کی بو سے نفرت ہے۔ شاید پہلا بار وہ اپنے گاؤں گنڈوں اُس کا منہ بد مزہ دیکھا اور  
وہ تعجب کریگا کہ یہ کیوں لوگ ایسی زہریلی اور کڑواں چیز کے ایسے گردیدہ ہیں کہ چندی  
دلیں میں اُسکی نفرت خاندان پر پاتی ہے اور وہ بھی اب سوخ کا غلام ہو جاتا ہے۔ گنا  
کا مزا شراب سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔

پرتاپ نے زمانہ بہت ہی آہستہ آہستہ جارا تھا۔ اس کے قدم جلد جلد نہیں اٹھتے  
تھے کیونکہ گناہ نے اُس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اس کو لہ آمیز مسرت کا  
جوا ہے موقعوں پر قدموں کو تیز کر دیتی ہے۔ اس کے چہرہ پر کبھی انسان نہ تھا۔ وہ چلتے  
چلتے رک جاتا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھتا تھا۔ شیطان اُسے گناہ کے غار میں لے  
کھینچ لے جاتا ہے۔

پرتاپ کا سر دم دم کم ہوتا تھا اور خوف سے پٹلیاں کاٹ پڑی تھیں۔ سوچتا  
۔ چارنا گھنٹہ بھر میں دھنشی دنیا ماچرن کی عالیشان جویلی کے سلنے پر پہنچا۔ آج ناہیلی  
میں یہ جویلی بہت ہی بھیاں تک معلوم ہوتی تھی جیسے گناہ کا بھوت سلنے کھڑا ہو۔ پرتاپ

دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اس کے پیروا نہ دئے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ یہی سوچتا رہا کہ لوٹ چلوں یا اندھاواں، مگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائیگا۔ برجن مجھے دیکھ کر دل میں کیا سوچیں گی کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ حرکت مجھے ہمیشہ کے لئے اُس کی نظروں سے گمراہ کر دے مگر ان سب اندیشوں پر شیطان کی کشش غالب آئی، نفس کے بس میں ہو کر انسان کو نیک بے تکلیف نہیں باقی رہ جاتی۔ اُس نے دل کو مضبوط کیا، احساس بُزدلی پر اپنے تئیں حلاوت کھانے لگا۔ اجناناں مکان کے عقب کی طرف جا کر باغیچہ کی چہا ہدیادی سے اندر چھا ندیا۔ باغیچہ سے مکان کے اندر جانے کے لئے ایک پھونٹا سا دوا نہ تھا۔ اتفاق سے وہ اس وقت کھلم کھلا تھا۔ پرتاپ کو اس وقت بہ ایک فال نیک سامحوم ہوا مگر فی الواقع یہ غمانہ محسوسیت کا دوا نہ تھا۔ اندر جاتے ہوئے پرتاپ کے ہاتھ پاؤں ہنسنے پھرنے لگے۔ دل میں ایسی غضب زدہ گھبراہٹ تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ سینہ سے باہر نکلی پڑے گا۔ اس کا دم گھٹتا تھا۔ ایمان نے بالی بہت دور لگایا۔ اپنی ساری قوت صرف کر دی۔ مگر نفس کا پُر زور بھاد اندر تک سرکا پتا پ دوا نہ کے اندر داخل ہوا اور اندر آگ میں تلمش کے چہرہ کے پاس چوروں کی طرح کھڑا سوچتا رہا کہ برجن سے کیونکر ملاقات ہو مکان سے سب دوا نہ زب بند ہیں کیا برجن بھی یہاں ہے چلی گئی۔ یکایک سے ایک ہندوستان کے دروازوں سے ہلکی روشنی کی اشباح دکھائی دے دیکھتے ہی اُس کے جھکے ایسی تلخی بھری گویا ہوا میں اڑ رہا ہو گا۔ بے پاؤں اسی طرف چلا۔ اور دروازوں میں آنکھ لگا کر اندر کی کیفیت دیکھنے لگا۔ اُس کی سانس اُس وقت بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

برجن ایک سفید ساڑی پہنے چہرہ زرد۔ بال بکھرے تھے۔ فرش پر ہاتھ میں قلم لئے بیٹھی تھی۔ دیوار کی طرف دیکھ دیکھ کر کاغذ پر کچھ لکھتی جاتی تھی جیسے کوئی شاعر بحر خلیل

موتی نکل رہا ہو قلم کو دانستوں تلے دبا کر کچھ سوچتی اور لکھتی اور دُعا دیر کے بعد دیوار کی طرف تنکے لگتی۔ پرتاپ بہت دیر تک سانس روکے ہوئے یہ دلچسپ نظارہ دیکھتا رہا۔ نفس اُسے بار بار بھڑکے دینا لگ رہا ایمان کا آخری قلعہ تھا۔ اس وقت ایمان کا شکست کھانا گویا پہلوئے دل میں شیطان کا جگہ پانا تھا۔ ایمان اُتسارِج کے خوف نے اس وقت پرتاپ کو اُس نذر میں گرہنے سے بچا لیا جہاں سے مرتے دم تک اُسے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ نذرِ معصیت بچا نیوالا اس وقت ایمان نہ تھا بلکہ تسارِج کا خوف و پشیمانی کا خیال۔ بسا اوقات جب ہمارا ایمان مغلوب ہو جاتا ہے تو تسارِج کا خوف ہم کو بدکرداریوں سے بچا دیتا ہے۔ برجن کے چہرہ پر باوجود زندگی کے ایسا ایسی رونق تھی جو قلب کی صفائی اور خیال کی بندگی کا پتہ دے رہی تھی۔ اُسکے لبشہرے کی متانت اور نگاہ کی پاکیزگی میں نفس سرکش کے لئے ڈھانکنا نذرِ نیا نہ تھا جس سے پرتاپ کے نفس کا جانیو نامحال تھا کیونکہ راہِ معصیت میں اُس کا یہ پہلا سفر تھا وہ ایسا مؤثر ہوا کہ رشتے لگا۔ نفس نے جسے خیالاتِ فاسد اُس کے دل میں پیدا کر رکھے تھے وہ سب اس نظارہ نے یوں غائب کر رکھے جیسے اجالہ اندھیرے کو دُور کر دیتا ہے۔ اس وقت اُسے یہ خواہش ہوئی کہ اس کے پیروں پر گر کر اپنی ان خطاؤں کی معافی مانگ لوں۔ جیسے کسی مہاتما سنیاسی کے روبرو جا کر ہمارے دل کی کیفیت ہو جاتی ہے اسی طرح پرتاپ کے دل میں خود بخود غراؤ احترام کے خیالات پیدا ہوئے۔ اپنی اخلاقی پستی پر ایسا ناام ہو گا کہ برجن کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی شیطان یہاں تک لایا کہ آگے نہ لیجا سکا۔ وہ اُلٹے قدم لوٹا اور ایسی تیزی سے باغیچے میں آیا اور جہاں دیواری سے باہر کُودا گویا کوئی اُسکے تعاقب میں ہے۔

صبح کا ڈبکا وقت ہو گیا۔ پرتاپ کے ایمان کی طرح آسمان میں تلے بھجلا رہے تھے اور

اچھی کی گھر گھر آواز کانٹ میں آتی تھی۔ پرتاپ پر دباتا۔ آدمیوں کی نظریں پچاٹا گنگا جی کی طرف چلا۔ یکایک اس نے سر پر ہاتھ رکھا تو لڑکی کا پتہ نہ تھا اور نہ جیب میں گھڑی دکھائی دی۔ اس کا کلیجہ سٹن سے ہو گیا اور دل سے بے اختیار ایک آواز نکلی آئی۔

بعض اوقات ہماری زندگی میں ایسے واقعات ہوجاتے ہیں جو دم زدن بنا سکی صورت پیش دیتے ہیں کبھی لالہ پن کی تر بھی نکلے بیٹے کو نیک نامی کے ساتھ یہ سماں پر پیدا ہوتی ہے اور کبھی مری کی ایک نصیحت شود کہ جو ہمارا پیشی بنا دیتی ہے غیر متدہستیاں اپنے بگاڑوں کی نگاہ میں دلیل ہو کر دنیا کا بوجھ بٹھا نہیں رہا اشت کر سکتیں انسان بن گئی میں ایسے خوفناک وقتوں میں پرتاپ چند کی زندگی میں بھی ڈمباک وقت تھا جب سچا رگدیں میں ہوتا مرانہ کنگا کے کنا لے کر بیٹھا اور اسٹورف نہ امت کے آستو پہانے لگا۔ نفس کی حوصلہ نگہ میں لے لے لے دلیل و خوار کر دینے کوئی کمر نہ رکھی تھی مگر اس کے لئے یہ تازیانہ استلا مہربان کا تازیانہ ثابت ہوا کیا یہ تجربہ نہیں کہ زہر بھی بعض اوقات آب حیات کا کا دیتا ہے

سب طرح ہوا کا جھوکا مسکنی تہی آگ کے دہکے کا دیتا ہے اسی طرح ہمارے دل میں دے دے جوش کو متحرک کرنے کیلئے کسی ظاہری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے اپنی مصیبت کا تجربہ اور دوسرے کی مصیبت کا نظارہ ایسا اوقات دل میں ڈیرا لگ پیر کر دیتا ہے جو صحت بظالم اور خلقی مناسبت کے اثر سے بھی ممکن نہ تھا۔ اگر یہ پرتاپ چند کے دل میں نیک اور بغرض زندگی بسر کرنے کا خیال پہلے ہی سے تھا مگر نفس کے اس تازیانہ نے وہ نرالی ایک ہی لمحہ میں طے کر دی چکے طے ہوئے میں برسر لگتے۔ اس کی زندگی کا لادہ مستقل ہو گیا معمولی موٹے قدموں قومی ہمت اس کی زندگی کا ایک چھپا ہوا لبامزوی مشغلہ ہوتی مگر ان واقعات نے قوی خدمت کو اس کی زندگی کی غرض کو غامت بنا دیا۔ سما کی زلی آرزو پوری ہونے کے سماں پیدا ہو گئے کیا ان واقعات کی یہ کوئی غیبی طاقت متحرک تھی۔ کون کہہ سکتا ہے۔

ہر دوا سے بہت دُور شمال کی طرف پہچان پہاڑوں میں ایک چشمے کے کنارے  
ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جگہ بہت خوفناک تھی۔ درندہ من دہاڑے چھل قدیریا  
کرتے تھے مگر بیٹھنے نہ پڑا۔ ایک ہی چٹان پر بیٹھا رہتا۔ ڈھنگ کا بہت مضبوط تھا اس  
کے ہر سے وحشت برستی تھی۔ کپڑے پھٹ پھٹ کرتا رہا نہ کٹے تھے۔ بال بڑھائے تھے، بڑا ہوا  
ان باتوں کی اُسے مطلق پروا نہ تھی۔ اُسکے پاس نہ اڑھتا تھا نہ بستہ نہ برتن نہ بھانگہ کبھی  
کبھی جنگل چل کھالیا کرتا تھا۔ ایسا لے کر سامان آدمی کس نے دیکھا ہوگا۔ یہ پرتاپ چند تھا۔  
پرتاپ چند کو یوں اسیر کرتے کئی چیلنے گزر گئے ہیں وہ اپنے نفس سے لڑ رہا ہے مگر  
فتح نہیں ہوتی۔ اُس نے دشمن کو جیسا حقیر سمجھا تھا اُس سے بد رہنا طاقتور پایا جس وقت  
مکہ اللہ آباد میں تھا ذاتی عیش و تنعم کے خیالات اُسکے دل میں نام کو بھی آتے تھے مگر اس  
ویمانے میں اس کا خیال بار بار انہیں باتوں کی طرف جھکتا۔ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کا میاں  
نہ ہوتا۔ اکثر ایک نازنین کی تصویر اُسکی نگاہوں کے سامنے آکر سُری ہو جاتی جو برجستہ بہت  
مشاعرہ جی تجیل ایک عالیشان مکان بنواتا۔ اُسے کلات لٹا دے سجاتا۔ جان بخش نمود کو  
بیٹھی لہجہ کا توں میں آئے لگتی عاشقانہ جھپٹ چہانہ اُد معشوقانہ شیرازہ دایم کے دو چلنے لگتے  
گھنٹوں اسی پر سروغلاب کے رنے۔ اُسٹا پھر لکاکٹ چونگ پڑتا کہ میں کیا سہو باتیں سوچ رہا ہوں  
لو حیات کو پھر یہاں کو مسئلہ پیش نظر چھاتا مگر پھر وہی کی ریشمیں لہانیاں اُد غزلوں کی



کلیلیں خیالات کے قدم میں نہ بھیر کر انبار کا کام کرتیں یہاں تک کہ وہ ایسے ہو کر اٹھ کھڑے ہوں۔  
 دلیں کہتا کہ میری زندگی یوں ہی خواب دیکھنے میں گزریگی۔

رفتہ رفتہ اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ کھانے پینے کی مطلق سندھ نہ رہی۔ سویرے شام تک  
 دلوانہ دار بیٹھا ہوا دانتوں کی شاخوں اور پتھر کی چٹانوں سے نظریں ملایا کرتا۔ خیال کی طاقت  
 بڑی بڑا درست ہے۔ قومی خدمت کے خیال میں غرق ہوتے ہوتے اُس کے دل میں درد کا سچا جذبہ  
 پیدا ہوا جس کے بغیر بغیر خدمت محال ہے کسی بوٹھے ضیعت کو لکڑیاں توڑتے دیکھتا تو خود  
 اُسکی لکڑیاں توڑ کر اُسکے گھر تک پہنچاتا۔ بھولے بچکے مسافروں کے ساتھ لیکر ہادی تک  
 جاتا۔ ان کاموں میں اُسے دھلی دسترس حاصل ہوتی یہاں تک کہ اُس پاس کی آبادیوں میں ان کی  
 کاموں کا شہرہ ہو گیا لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی جہاں تار پڑتی ہیں۔ عورتیں آتیں کہ مجھے سال بھر سے  
 لڑکا ہتھیں مہا کوئی دھنا تعویذ دینے۔ مرد آتے کہ میرے روزگار کی فکر کر دیجئے۔ آخر  
 پرتاپ چند یہاں۔ بے نیاز کر بھاگا اور دشوار گزار گھاٹیوں کو چیرتا ہوا بہت دور تک  
 گیا۔ یہاں ایک کوچی چنی پناہ ایک چھوٹی سی منڈھیا تھی۔ اُسی کے قریب ایک چٹان  
 پر اُس نے بھی اپنا آسن بچایا۔

یہاں بہتے اُسے پھر پیچھے گزر گئے اور اب اُسے اپنے دلیلیں ایک باطنی طاقت محسوس  
 ہونے لگی۔ جذب خیال کی قوت پیدا ہو گئی مگر اُسکی آتما ابھی تک کمزور تھی اس کا اثر بھی  
 اُسے جلد مل گیا ایک درشام کے وقت وہ بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک شہر کی ہولناک گرجیں اُس  
 کے کان میں آئی۔ آواز سننے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل دھڑکنے لگا۔ مگر وہ سب  
 بیٹھا اور ادھر ادھر کوئی نگاہوں سے تاننے لگا کہ آواز کدھر سے آئی ہے کیا دیکھتا ہے کہ ایک  
 خوشنما شیر خنجر کھنکھارے ایک بس ہرن پر لوٹ پڑا ہے اور اپنے آہنی جبرے اُسکے گرد

میں چھپا رہا ہے۔ اُسکی آنکھوں سے خچر گاریاں نکل رہی ہیں۔ یہ میناک نظارہ دیکھتے ہی پرتاب چند کا ہبلا چھوٹ گیا وہ بے اختیاری طور پر اٹھا کہ منہ میں جا چھپاں مگر اسی اٹنا میں ایک غرائم شخص جسکی ریش دراز ناف تنگ آتی تھئی تھی اور چہرہ بد نما کی طرح منور تھا۔ ہاتھوں کی سگنتا سائلے مجھے نکلا او طیرانہ قدم بڑھاتا ہوا شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر جھلایا تو تھا ہی شعلہ بد آنکھوں سے گھومتا ہوا دورا مگر نہ دیکھ سکے ہی اُس کی آنکھیں جھپک گئیں اور ایک خطا وار شخص کی طرح جو اپنے آقا سے معافی کا طالب ہنر میں لبرٹ گیا بسا۔ صوفے سے اُٹھ کر اُس کو آغوش میں اٹھالیا اور مندر میں لاکر مگر بچھالے پر لٹا دیا۔ چند بوٹیاں پتھر پر گھسکر اُسکے زخموں پر لگائیں اور تب اپنی کہنی کو جس پر تازہ گلہا خون زیب دے رہے تھے دھولے کئے لئے چھتے کی طرف چلے۔ جیسے کوئی شیلوکا پوجاری کل کے بھوؤں کو جل دان کے لئے لیجاتا ہو پرتاب اس حیرت انگیز روانی کو شہ سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ دیر تک نقش دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر سوجھے لگا افسوس کیا میری امت اتنی کمزور ہے کیا مجھ اپنی جان اتنی پیاری ہے!

پرتاب چند اپنی اس بزدلی پر ایسا جھنجھلا گیا کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں خون جوش کھانے لگا۔ ایک مضبوط لکڑی کا کندہ اٹھا کر کسی بدست مشربی کی طرح اڑھڑاتی ٹانگوں سے دوڑتا ہوا شیر کے گلے پر جا پہنچا۔ شیر نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی اُس کے پتور بدل گئے۔ بلبل کی طرح گر جا اور قریب تھا کہ جست مار کر یہ تاپسی گردن بچے کہ اتنے میں اس نے لکڑی کا کندہ اپنی پوری طاقت اُس کے سر پر ٹیک دیا مگر شیر کے فولادی سر پر اسکا کیا اثر ہو سکتا تھا اور بھی جھلٹایا اور اس نے اُسے گر جا کہ جنگل کے تمام جانوروں اپنے اپنے کیمین گاہوں سے نکل پڑے اور دونوں اگلے پنجے اُسکی کمر میں ڈال دیئے۔ دفعتاً اُس کے

سر پر گندے کا بھر پڑ ہاتھ پڑا بلیش کھا کر پیچھے کی طرف نہ دیکھا تو سادھو بابا کھڑے ہیں اس نے فوراً پرتاپ کو چھوڑ دیا اور درد سے کرا ہوتا بھاگا۔

پرتاپ چند نے ان بابا جی کو اکثر مندر سے آتے جاتے دیکھا تھا مگر اس وقت جو اد نزدیک سے اُن کے پر لعل چہرہ پر نگاہ ڈالی تو صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔ سوچنے لگا کہ میں نے انہیں دیکھا ہے مگر حافظہ نے باری نہ دی۔ نہ اُمیت سر جھکا کر بولا: میں نے آپ کو کہیں آؤ دیکھا ہے؟

سادھو جی نے مسکرا کر فرمایا: "یہ کیوں نہیں کہتے کہ جوں آپ کی گود میں کمیلا ہوں" اتنا سنتے ہی پرتاپ کی آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ کلیجہ نے جست ماری اور لبوں تک پہنچا۔ ایک پرچہ شہ ناز نہانہ ہینڈی کے ساتھ اُن کے سینے سے لپٹ گیا اور اُنکھوں سے آنسو کے قطرے گر لے گئے۔ نشی سمجھون لال نے پدرانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آستو پو پچھے:

## تیسری

جیسے کوئی مچھڑا میں بڑی کشتی طوفان کے تھپیڑوں اور تلاطم کے بھکڑوں سے اپنی جان بچا کر کسی بندرگاہ کے آغوش میں جا پہنچتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ چند بابا ایک ایسے مسکن میں آگیا تھا۔ جہاں اُس کے دماغ کو اطمینان تھا اور دل کو قرار۔ وہ اب اُس بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح نہ تھا جو اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو۔ اب اُسے اپنا راستہ اُس کے نشیبِ فرائد اور منزلِ مقصود صاف نظر آتے تھے۔ منشی سمیعون لال کی صحبت اور تکلیف نے چند ہی مہینوں میں اُس کے دل سے وہ کمزوریاں محو کر دیں جنہیں وہ سخت کوشش کے بعد بھی دور کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہوا تھا۔ ایک عارفِ کامل کی چند روزہ صحبت نے اُس کی نفس کے لئے برسوں کی اندرونی کشمکش اور مطالعہِ بلند جہاں زیادہ مفید ہوتی ہے منشی جی اُسے ہر روز بھگوت گیتا پڑھاتے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی بحرِ عشق کی خواہش میں صرف کیا تھا اور اصرار تین چار سال تک کرتے ہی یوگیوں اور سنیوں کے خرم و افس سے غوطہ چینی کی تھی۔ وہ ایک پاک نمکتی ایسی تشریح کرتے۔ انکا ہجر ایسا دلکش اور طربان ایسا سرور انگیز تھا کہ پرتاپ پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ ان کے ایک ایک لفظ میں اثر ہوتا تھا جو کسی خانقاہِ روحانیت کے بسنے والے ہی کی باتوں میں ہو سکتا ہے۔ پرتاپ چند کے خیالات روز بروز زیادہ پاک، زیادہ میخیز اور حصے زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ اُس نے لوگ کی مشق بھی شروع کر دی تھی پورا

جوں اس میدان میں قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اُسکی ہمدردیاں زیادہ وسیع اُدھائی جاتی تھیں۔  
 اس طرح دو سال گزر گئے۔ پرتاپ پند کے قوائے جسمانی شیر دل کی طرح مضبوط اور  
 تیز منہ ہو گئے۔ ادبچی سے ادبچی پہاڑیوں پر بے تکان چڑھ جاتا۔ منزلوں کی مسافت طے کر کے یوں  
 بیٹھتا کہ یا کسی باغ کی سرک کے لوٹے۔ قوتِ برآشت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ برفستانی  
 چوٹیوں کے سنگین چٹانوں کا بستر بنا کر ایسے آرام سے لیٹتا کہ گویا آراستہ مکان میں محلی گدوں پر لیٹا  
 ہوئے ہے۔ اس کا پہرہ ایسا روشن ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ اُس پہرہ کو  
 تک بکھرے ہوئے بال اور دسے بھری ہوئی آنکھیں اُسے رزم کی مودت بنائے دیتی تھیں۔  
 روشن رخساروں پر سنہرے ندیدہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا برفالے شمع پر نشانہ ہوئے ہیں  
 کیسا حسنِ موزانہ تھا کہ پہلی ہی نظر میں اُس کی تصویر پر وہ دل پر ہمیشہ کیلئے بچھ جاتی تھی  
 یقیناً جب اپنا آئینہ بھگا کر لوگ سا دھن کرتا بھگا تو کیا لاش کی۔ ایسے والی ایسا میں اس  
 پر نشانہ ہونی ہونی جیسی وقت و بڑی بڑیوں کا بچہ لیکر قوم بڑھاتا تھا چلتا تو پہاڑوں کے پنے  
 والے مُراد غودیں اضطراری طور پر اس کے رو رو سر چھکاتے اور جس وقت تک بھاڑیاں  
 اوجھٹائیں اُسے اپنے دامنوں میں چھپا لیتیں اُسکی طرف نگہ لگا کر دیکھا کرتے۔ اُس کے  
 علاج میں تاثیر تھی۔ باتوں میں مٹھاس اور آنکھوں میں جھلک کہ گزرتی تھی کہ لوگ سمجھتے وہ لوگ کوئی بڑی  
 ایک نہ سمجھ لال نے پرتاپ چند سے کہا۔ بالاندر و بالا یہ ہیں اب سر مقامات کی سر  
 کمروں اس پاک سر زمین میں کتنی سندھیا سی اور شبنم سے منہ موڑ کر جھکوت سمجھ کر رہے ہیں میں  
 نالیکار سب کے دشن کر لئے ہیں مگر اب پھر اُن کے دشنوں کیلئے جی بے چین ہو رہا ہے۔

پرتاپ۔ میں بسوچتے حاضر ہوں۔ یہاں سے کس طرف کا قصد ہے ؟  
 بیچون لال۔ پہلے سنت ڈھاک کو چلیں گے وہاں کی مہلتاؤں کو دشن دینگے۔ وہاں سے پورب کی

طوت کیلاش ہے۔ کیلاش سے سیدھے گیان مرنو کی طوت سدھا بیٹے۔ ایسا  
دلکش مقام برہم زمین پیدا کرہین ہوگا۔ عین گمر کے کنائے شری برہما ننج کا  
دھا ہے اُنکے قد نکل سوچھ کاٹیں گے۔ مجھے کہتے ہی ریشوں سے فہن محبت کلموق  
ہے مگر برہما ننج تاروں میں چاند میں بہترین لیکھ رہ بہت خوش ہوئے۔

پر تپا چند نے روانگی کی تیاری کرنی شروع کی اڈ تیاری ہی کیا تھی و مگر تھالے  
بڑی بوتیوں کا بچہ اڈ چید کا بیل اس مسکن کی ساری کامات تھی۔ انہیل سے لے لیل میں  
دھایا اڈ دونوں آدمی ہل کھڑے ہوئے۔ مگر اچھی تہاڑی سے اترے بھی نہ تھے کہ جنگلی جانوروں  
کے غول کے غول چھیچھے چلاتے اچھلے کودتے نظر آئے۔ ہرن بیکریاں۔ ریچھ۔ شیر۔ چیتے  
سب کے سب پہلو پہلو بھاگے چلے آتے تھے۔ گویا ہر ایک اپنی دھن میں ایست  
تھا کہ اُسے دُسرول کی خبر نہ تھی۔ ان کی آن میں ان جانوروں نے دونوں بھگدوں کے  
گردہ حلقہ ماندھ لیا۔ کوئی اُن کے ہاتھ چلنے لگا۔ کوئی بیوں پر سر گرٹنے لگا۔ کوئی  
دُزار کُٹ فائر میں جھج رہا تھا۔ کوئی اکڑوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاک رہا تھا۔ گویا اپنے محسن  
کی جلتی کا منہ اظہار کی قابلیت سے بہت زیادہ دلزدہ تھا۔ بے تیا لوں کے دل میں بھی  
وہی جذبہ محبت اڈ وہی صدمہ ذرا ہونا جو حضرت انسان ننگلا تلخ کر دیا کرتا ہے  
اگر یہ اس کا اظہار صرف انہیں لوگوں کے روبرو ہوتا ہے جن کی اندرونی آنکھیں کھلی  
ہوتی ہیں اڈ جسکی آتما میں اس قدر سلع ہیں کہ جسم ظاہر کی نیرنگیاں اُن کا احاطہ نہیں کر سکتیں  
اس کو ہستان کے ایک ایک پتے کی روح سے اُن دونوں آدمیوں کی سمجھ تہندی تھی۔ اُن کا مسکن  
اے بے زبانوں کی خوش فحلوں کا اکھاڑ تھا اڈ اُن کے ننھے ننھے تو نصرت بکوں کے سونے کا  
گہوارہ اڈ کلکیلیں کھنے کا میدان۔ اس پُستھر حلقہ میں اگر اُنکی باہمی رنجشیں اڈ کدو میں مٹ  
جلیا کرتی تھیں۔

شام گئی تھی او دونوں آدمی مردانہ انداز میں چلتے چلتے جاتے تھے۔ الیہا معطوم  
ہوتا تھا اس کو ہستان کا یکل یک گوشہ کا نقشہ اُنکی نگاہ میں کھینچا ہوا ہے۔ نہ اُنکے  
قدم پھلتے تھے نہ ڈنگ لگتے تھے۔ تیروتا روادیاں جہاں شاید کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا  
ہو اور غمزدی چوٹیاں جسکی بانندی کو برسے ہی نگاہ حسرت سے دیکھیں۔ اُن کے لئے ایسے  
آسان اندیشے ہی گزرتے تھے۔ جیسے کوئی صادق بھٹری سڑک۔ یا کسی باغ کی روش اُنکے  
دل مودوں کے دل تھا وہ اعضا شیروں کے۔ پرتا پک تو خیر عنفوان شباب تھا مگر  
نشہ جی بھی باوجود پیرائے سالی کے ایک چٹان سے دُری چٹان پر بے دھڑک کود جاتے  
اور ریشور کو ہستانی نالوں میں بے محابا فحش پڑتے۔ گویا ان مہالغات ظاہر کی اُنکی  
نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔

اس طرح بادھیمائی میں کئی چمپنے لگے۔ دن بھر راستہ چلتے اُنہیں کدورت  
کسی جہاں تارشی کے اُنھان پر پھٹ جاتے اور ماس کے ست سنگ سے فیضیاب ہوتے پرتا پک  
چند کاکڑ یہ خیال گزرتا کہ اگر فقر اقدسی صفات کی خدمت کی طرف منہجہ ہوتے تو مگر  
فریب۔ جموجہر کا نشان مٹا دیتے۔ کیسے روشن دل لوگ تھے کیسے مستغنی! دولت  
وشہرت۔ ثروت و جلالہ نام و نمند اور دوسری دنیاوی نعمتیں جو حضرت انسان کی زندگی  
کا معراج خیال کی جاتی ہیں اُنکی نگاہ میں محض ہکینہ سے تھے جو حقیقت کے موتی اور  
گیان و سرور کے نواح میں آ پہنچے آہ! کیسا سہانا منظر تھا اسے دلکش کہنا اس کی  
ذمت کرنا ہے۔ مگر دنیا میں کوئی جگہ ایسی ہی ہے جسے اُنکی کہہ سکیں تو وہ کواہ مہالہ  
ہے اور یہ جگہ اس آئینہ کی پٹیلی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے پرانوں میں دیولوک کا مقدس  
نام دیا گیا ہے۔ یہاں گندھرب اور اسپرہٹیں بسنی ہیں انسان کے بہشتی نعموں کی دلائل و

حدِ اشتقاق کے کائنات میں باقی ہے۔ پرتاپ پر اس منظر نے خود مستی کی کیفیت طاری کر  
 دی۔ نگاہیں جدر جاتیں اُدھر سے ہلنے کا نام نہ لیتیں۔ روحِ اودِ قلب پر ایک تعین  
 آمیز رعب چھا رہا تھا۔ کوئی کیسا ہی بے اعتقاد شخص کیوں ہو مگر اس پاک سرزمین  
 میں داخل ہوتے ہی اسکی روح پر دُسرود ہوگا جو اسے مدتِ عمر یاد رہے گا۔ یہاں کی مہا  
 میں سائنس لینا اُدھر یہاں کی زمین پر قدم رکھنا جاؤ وہ اسیت سے شاد کلام ہو رہا ہے دونوں  
 طرف جہا تک نگاہ جاتی ہے سربِ فلک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایک کے اوپر  
 ایک۔ ایک لپٹ لپٹ برقیاء رگی کے ساتھ لدی ہوئی ہیں۔ گویا آسمان پر منٹولانے والے بال  
 پہلی میر کرنے کے لئے اُڑتے ہیں اُنکی چوٹیں پر جا بجا برف کے تودے پڑے ہوئے  
 ہیں۔ جنہیں آفتاب کی آخری شعاعوں نے زور نگار بنا دیا ہے جیسے اتنی لمبائی پر  
 بودھانِ بنفشی کے لئے سنہرے تختِ مچلے گئے ہوں۔ انہیں پہاڑیوں کے بیچ چیا  
 گیانِ سرور آہستہ آہستہ موجیں مار رہا ہے۔ گیان کی طرح اعقابہ ادا پارہ اُس میں نہیں  
 بلکہ وہ بجکے خوشِ فعلیاں کر رہے ہیں۔ گویا آسمان پر تارے سے نکلے ہوئے ہیں۔  
 یہاں ایک بنفشی سمیوں لال لے کہا۔ ”بالا جی دیکھو جھیل کے کنارے دُچھوٹی سی  
 کٹی ہوئی نظر آ رہی ہے جہاں پر ہما ندجی کا مصحفان ہے۔“ یہ منظر ہی اشتیاق لے پرتاپ  
 چند کے قدم اُد بھی تیز کر دئے۔ خدا دیر میں دونوں آدمی کٹی کے دروازے پر پہنچ گئے تو  
 کیا دیکھتے ہیں کہ سماوی برہما ندجی جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے سندھیا  
 کرنے میں مصروف ہیں۔ اُنکا چہرہ ایسا پر مچلبل ہے۔ گویا آفتاب ابھی ابھی گیانِ سرور  
 کے آغوش سے نکل آیا ہے۔

\*~\*

\*~\*



## برجن شاعرہ ہو گئی

جب نشی سمجھن لال تیرھ جا تر اکونکلے اور پرتاپ چند الہ آباد چلا گیا اس وقت  
سبامانی زندگی کی روشن باہل تبدیل ہو گئی تھی اُس نے ٹھیکہ کے کاموں کو ترقی دینا شروع کیا تو  
اُسے نہایت وسیع پیمانے پر پہنچایا بستی جی بدستور دیانت اور ہوشیاری سے اپنا کام کرتے تھے۔  
نشی سمجھن لال کے زمانے میں بھی کلہو بار کو اتنا فروغ نہ حاصل ہوا تھا عیال و اولاد کی دلت  
بیٹھے اینٹ پتھر سے سرمایہ کرتی تھی اور سڑکی چلنے کے فکر میں پریشان تھی۔ پانی پانی کا حسرت  
جا بچتی اور کبھی کبھی خود مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال کرتی۔ ان کاموں میں اُسے ایسا اہم کام  
ہوا کہ ان اوبرتے جو اُس کے پہلے نے شغل ختم کسی قدر لا پرواہی ظاہر ہونے لگی باوجود  
افراد آمدنی کے سبب انہیں خرچ کی کوئی مدد زیادہ نہ ہونے دی۔ کوڑی کوڑی دانوں سے پکرتی  
اچھڑ سبائے لکھ پرتاپ چند صاحب مال ہو گئے اور اپنی زندگی بھر فارغ البال خوشحال رہے۔

سبامانی اپنے بھتیجے پر ناز تھا۔ اسکی زندگی کی رفتار دیکھ کر اسے یقین  
ہو گیا تھا کہ جو سندھو دل میں رکھ کر میرے اولاد مانگی تھی وہ آرزو مند یوری ہوگی۔ وہ کالج  
کے پرنسپل اور پروفیسر بن پرتاپ کا حال خفیہ طور پر دریافت کرتی تھی اور انکی رپورٹوں کا  
مطالعہ اس کے لئے ایک لچسپ فسانہ تھا۔ ایسی محدث میں الہ آباد سے پرتاپ چند کے  
لاپتہ ہو جانے کا تاثر پہنچا گیا نل دماغ پر کبھی کا گرتا تھا۔ سبامانی ایک ٹھنڈی سانس  
لی اور سر ہٹا کر بیٹھی۔ تیسرے دن پرتاپ چند کی کتابیں کپڑے اور دوسرے

اسباب بھی آپہنچے۔ یہ زخم ہراؤ چرکا تھا۔

ایک دن وہ پرتاپ چند کی کتابیں الٹ پلٹ ہی تھی کہ اُسے ایک لٹری ماڈل میں بہت سے خطوط حفاظت سے لپیٹے ہوئے دکھائی دئے۔ یہ برجن کے خطوط تھے۔ سُباما انہیں پڑھنے لگی اور ایک ایک کر کے سارا دفتر ختم کر ڈالا۔ آج وہ پہلی دفعہ دوسرے دن جب برجن نے خبر سنی تو وہ گھبرائی ہوئی سُباما کے یہاں آئی۔ سُباما نے چھٹیل کا ایک پلندا اُس کے سامنے پھینک دیا اور منہ پھیر لیا۔ برجن کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غرور لہجے میں بولی: ”چچی۔ اس بدتمیزی پر آپ بہت پھتائیں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اُلٹے قدم اپنے گھر لوٹ آئی۔

پریجنی کے مرنے کی خبر پاتے ہی پران ناٹھ پٹنہ سے اُردھا چرن بینی تال سے روانہ ہوئے۔ اس کے جلیے جی آئے تو ملاقات ہوتی مرنے پر آئے تو مٹی دیکھنی بھی نصیب ہوئی۔ مرنے کا سسکا رہ سب بڑی دھوم سے ادا کئے گئے۔ دو سہفتہ گاؤں میں خوب چلی پہل رہی۔ اس کے بعد اُدھا چرن مراد آباد چلے گئے اور ان ناٹھ نے پٹنہ چلنے کی تیاری شروع کی۔ انکا ارادہ تھا کہ بیوی کو الہ آباد پہنچائے ہوئے پٹنہ جائیں مگر سیوتی نے ضلک کی کہ جب یہاں تک آئے ہیں تو برجن کے پاس بھی منور چلنا چاہئے۔ اُسے صدمہ ہوگا۔ سمجھ گئی کہ بھئی بیکس سمجھ کر ان لوگوں نے بھی تیار کیا۔ لالو نے بہت جیلہ و جھٹ کی کہ مجھ سے جواب ہو جائیگا۔ محفل ہو جائیگا کیا عجیب کہ تنزلی کی بھی نوبت آجائے آخر سیوتی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انکی طرف اس لڑکھی نگاہ سے دیکھا جس میں ایسی بھی آواز جھٹ بھی بند ہو جاتی تھی اور رضا بھی۔ لالو اس نگاہ سحر کا کی تاب نہ لاسکے۔ رضالے و کا کر دکھایا۔

سے مشکل تھا۔ بیوی کے گلِ عارض کا پوسہ لیکر بولے: ”مردیں کیوں؟“

سیونی تم رانے لگے ہی ہو۔

پیران ۱۔ چھانپتا رہا ہی کہنا کریں گے۔ لو اب خوش ہوجاؤ  
 للو مدہوش ہو گیا۔ اس نگاہ میں خوں کا نشہ تھا۔ اسی نگاہ نے گھر تباہ کر دئے  
 ہیں گلوچ پتھر چلا دئے ہیں سلطنتیں مڑا دی ہیں۔ لکڑے کو کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا  
 صرف ایک عزیز غمہ سے پاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ننھی سی لکڑی میں کتنی طاقت ہے!  
 سیونی کا اس خاندان میں آنا گویا پھولوں میں مہک کا آنا تھا۔ ہفتہ بھر کے  
 لئے اچھے دھن کی بُو باس آگئی۔ برجن بہت خوش ہوئی اور خوب ہنسی۔ مادھوی نے  
 منہ کو گود میں لیکر خوب سا پیا کیا۔ مردانے کمرے میں بندھے سے بندھے آج اکی  
 قیمتیں بھی کھلیں۔ اُجڑا ہوا آشیانہ لبیا

پریوتی کے چل جانے کے بعد برجن اس گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ صرف مادھوی  
 اس کی انیس و غنچہ رہتی۔ اس تنہائی۔ سوزِ فکر اور دردِ دل نے اُس کا وہ ذاتی جوہر کھلیا  
 جو اب تک چھپا ہوا تھا اور جس نے اُس کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ شعرو سخن  
 میں طبع آزمائی کرنے لگی۔ شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ وہ  
 درد کے ہوں یا مسرت کے اس وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں جب ہم دے دیا مسرت کا  
 مزا چکے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبان قلم تک اُٹنا تو ایک آسان  
 بات ہے۔ برجن ان دنوں رات کی رات بیٹھے بھاشا میں اپنے خیال کے موتی پرویا  
 کرتی۔ اس کا ایک ایک لفظ سوز اور یراگ کا ایک ایک لفظ فرتہ تھا۔ دوسرے شاعروں  
 کے دل میں دوسروں کی دواؤں اور سخنِ سخن کی سحان اللہ سے مولے پیدا ہوتے ہیں  
 مگر برجن اپنی داستانِ غم اپنے ہی دل کو سُنانے لگی۔ اس کے بلند خیالوں کی داد دینے

شمع خاموش تھی اور بسند فکر کو تازیانہ لگانے والی بیسی  
 سیوٹی کھائے دو تین دن گزرے تھے۔ ایک دن اس نے برجن سے کہا۔ میں  
 تمہیں اکثر کسی گہرے خیال میں ڈبا ہوا پاتی ہوں اور کچھ لکھتے بھی دیکھتی ہوں۔ مجھ  
 نہ بتاؤ گی؟۔ برجن شراب گئی۔ یہاں نہ کرنے لگی کہ کچھ نہیں۔ یوں ہی جی کچھ کھویا سارہ بتا  
 ہے سیوٹی نے کہا میں نہ مانو تگی۔ یہ کہہ کر وہ برجن کا صندوق اٹھا لائی جس میں سر  
 کے ابلار موتی لکھے ہوئے تھے مجبور ہو کر برجن نے اُسے اپنی تازہ نظم سنائی شروع کی  
 منہ سے پہلے مصرعہ کا لکنا تھا کہ سیوٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور جیتک ساری  
 نظم نہ ختم ہوئی وہ لقیں حیرت بنی بیٹھی رہی۔ پران ناٹھکی صحبت اس میں سخن مہنی  
 کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر تازہ مصرعہ سے اس کے گوشہ جگر میں ایک کسک سی ہوتی تھی  
 اور آنکھیں بھر بھرتی تھیں۔ جب برجن خاموش ہوئی تو ایک سماں بندھا ہوا تھا۔  
 جیسے کوئی دلکش نغمہ بند ہو گیا ہو۔ سیوٹی نے برجن کو گلے لگا لیا اور دوڑی ہوئی لڑکے  
 پاس گئی جیسے کوئی بچہ نیا کھلونا پا کر خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے بھولیوں کو دکھاتے  
 جاتے۔ پران ناٹھ اپنے آگے نامدار کو عرض لکھ رہے تھے کہ میری والدہ سخت بیمار ہو گئیں  
 اس وجہ سے حاضر خدمت ہونے میں پرہیز ہے۔ امید ابوں کہ ایک ہفتہ کی التافیر رخصت  
 عطا فرمائی جائے۔ سیوٹی کو دیکھ کر چیٹ اپنی درخواست چھپا دی اور مسکرائے۔ انسان کیا  
 مکالمہ ہے اپنے آپ بھی دھمکا دینے سے نہیں چوکتا۔  
 سیوٹی۔ ذرا اندر چلو بہتیاں برجن کی بکیت سنو تو بھڑک اٹھو گے۔  
 پران۔ اچھا اب انہیں بکیت کا شوق ہوا ہے۔ انکی بھالو بھی تو گایا کرتی ہیں۔  
 تو شمایا مرنے۔ بے کبر ہو۔

سیلوتی۔ ذرا چلکر سنو تو نیچے ہنسنا۔ مجھے تو اسکی شاعری پر اچھا ہورہا ہے۔  
 پیران۔ جلد ایک خط لکھ کر آنا ہوں ابھی  
 سیلوتی۔ اب یہی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں آ کے کاغذ لوح ڈالوں گی۔

سیلوتی پیران نا تھ کو کشال کشال لے آئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ برجین نے  
 کوئی معمولی مجھ بنایا ہوگا۔ اُسی کو سننے کے لئے بیقرار ہو رہی ہوگی مگر جب انداز کر بیٹھے او  
 برجین نے شرارت مئے اپنی پُرندہ نظم ”پریم کی موتالی“ پڑھنی شروع کی تو حضرت کی آنکھیں  
 کھل گئیں نظم کیا تھی درد دل کا ایک دریا اور از اُلفت کا ایک درخت تھی۔ لکھ سکتے تھے او  
 وہ ہیں آ آ کر کھد مٹے تھے۔ الفاظ کی ایک ایک کشت پر خیال کی ایک ایک پرواز پر  
 لے اختیار دل سے داد نکلتی تھی۔ انہوں نے بہت سے شاعروں کے کلام دیکھے تھے۔  
 مگر یہ بلند پروازی۔ یہ تازگی یہ جذبہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ اس وقت کا سماں بندھا ہوا تھا  
 جب طلوع آفتاب کے قبل بادِ نسیم لہرائی ہوئی چلتی ہے۔ کلیاں کھلتی ہیں۔ پھول مہکتے  
 ہیں اور آسمان پر ہلکی مریخی چھا جاتی ہے۔ ایک ایک شعر طرے بکھلے تازہ کی شادی او  
 شبنم کی تانگی موجود تھی۔ اُس پر برجین کا سر میلان اور آواز کی گرمی نشہ پر یادِ صبا کا کام  
 کر رہی تھی۔ اے! یہ وہ اشعار تھے جن پر برجین نے دل کو شمع کی طرح جلیا ہوا تھا۔ لکھتے  
 کی نیت سے آئے تھے مگر جب وہ اُٹھنے میں تو واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا گویا پہلو  
 سے دل نکل گیا۔ ایک لڑنا انہوں نے برجین سے کہا۔ ”تمہارا کلام چھپے تو خوب مقبول ہو“  
 برجین نے سر جھکا کر کہا مجھے یقین نہیں کہ کوئی اسکی قدر کرے گا۔

پیران نا تھ۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ اگر طول میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو تمہارے  
 کلام کی ضرورت قدر ہوگی۔ اگر ایسے لوگ موجود ہیں جو پھولوں کی مہک سے سرشار ہو

جاتے ہیں جو چڑیل کی چہک اور چاندنی رات کے سہانے بن کا لطف اٹھا سکتے ہیں  
تو وہ تمہاری کبتا کو ضرور دل میں جگہ دینگے۔

برجن کے دل میں وہ گنگدی پیدا ہوئی جو ہر ایک مصنف کو اپنے فکر سخن کی دا  
ملنے اور اپنے کلام کے مقبول و مطبوع ہونے کے خیال سے ہوتی ہے۔ تاہم وہ نہیں  
نہیں کرتی رہی مگر وہ نہیں ہاں کے برابر تھی۔ اللہ آباد سے اُن دنوں ”کملہ“ نام کا اچھا  
رسالہ نکلتا تھا۔ پرانے نامھ نے ”پریم کی موتالی“ کو وہاں بھیج دیا۔ ایڈیٹر صاحب ایک  
نکتہ سنج بزرگ تھے۔ دل کھول کر کلام کی داد دی۔ اور جب یہ موتالی نازنین کملہ کے  
دشمن ہیں لیکن لباس پہن کر نکلی تو لوگوں نے اسے دُشمن میں بٹھایا اور آنکھوں میں  
جگہ دی۔ شاید ہی کسی شاعر کی فکر اولین کو ایسی قبولیت عام نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن  
اور حیرت ایک دوسرے کا منہ نہ تھکتے۔ سخن فہم حلقوں میں ہفتوں تک موتالی نازنین کے  
چرچے رہے کسی کو یقین ہی نہ آتا۔ کہ یہ ایک گناہ شاعرہ کا کلام ہے۔ فیصلہ ہی  
تھا کہ اس شاعر کو الہام ہو گیا ہے۔

ابعد کملہ کملہ کے صفحے برجن کے کلام سے مزین ہونے لگے اور ”بھارت مہلا“  
کو پسند عام نے شاعری کے مستماع اور پر جا بٹھایا۔ ”بھارت مہلا“ کا نام بچہ بچہ  
کی زبان پر چڑھ گیا۔ کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جو ”بھارت مہلا“ کے کلام سے اپنے  
تئیں نہ سنوایا ہو۔ اخبار کھولتے ہی ناظرین کی آنکھیں ”بھارت مہلا“ کو دھونڈنے  
لگتیں۔ ہاں اُسکی آتش بیانیوں اب کسی کو حیرت میں نہ ڈالتیں۔ اُس نے خود شاعری  
کا معیار اونچا کر دیا تھا۔ قلم و سخن کی رانی کے لئے کمال شاعری عطا ہو گئی تھی اور کلتا ہی اعلیٰ  
کیونکہ ہوا ایک لازمی امر تھا کہ قابل حیرت۔

تین سال تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ”بھارت مہلا“ کون ہے۔ آخر  
 ناٹھ سے نہ رہا گیا۔ برجن سے انہیں سخن فہمائے عقیدت ہو گئی تھی اور وہ مہینوں سے اس  
 کے حالات زندگی لکھنے کی فکر میں پریشان تھے۔ سیلوتی کے ذبیحہ سے رفتہ رفتہ اس کے  
 زندگی سرے پیدا کر لئے اور ”بھارت مہلا“ کے عنوان سے ایک ہر روز مضمون لکھا۔  
 پران ناٹھ نے پہلے بھی کئی مضمون نہ لکھا تھا مگر فرط عقیدت نے ان کے قلم کو تیز  
 اور فصیح بنا دیا تھا۔ عبارت اول سے آخر تک چست اور خیالات پاکیزہ تھے۔  
 اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ برجن کو ہر چاروں طرف سے درد دانی کے نذرانے ملنے لگے  
 یادھا چمن مراد آباد سے اس کی ملاقات کو آئے۔ کمالہ۔ امدادی۔ بیتا۔ چندو کنور اور کتنی  
 ہی پُرانی سکھیاں جنہوں نے یاد بھلا دی تھی۔ ہر روز برجن کے درشنوں کو آنے لگیں۔  
 بڑے بڑے صاحب نظر و ساجو خود داری کے شان میں حکام کے دربار بھی سر جھکاتے تھے۔  
 برجن کے دودانہ کی زیارت کو آتے تھے۔ چند را خود تو نہ آ سکی مگر خط میں لکھ دیتا تھا  
 ہے۔ کہ تمہارے پیروں پر سر رکھ کر گھنٹوں بولوں۔ برجن کے دودانہ پر ہر دم  
 ایک میلہ سا لگا رہتا تھا +

## امتحان

منشی سیمون لال اور پرتاپ چند جوں ہی سوامی برہمانند جی کے دربار پہنچے  
 انہوں نے چونکہ نہ دیکھا، انکی بڑی بڑی آنکھیں نورِ حقیقت سے ایسی لبریز تھیں جیسے گیان  
 مسرور آبِ مقدس سے برفوں اور دروں نے اُن کے قدمِ سنگھوں سے لگائے سوامی جی نے  
 انہیں اُٹھ کر چھاتی سے اُٹھالیا۔ اور منشی جی سے دیر تک سفر کی کیفیتیں پوچھتے رہے بعد  
 اُن سے سکرا کر پرتاپ کی طرف سے دیکھا اور فرشتہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے "تم نے نہیں گئے"  
 پرتاپ چند کچھ حیران رہے مگر اُسے اس وقت سے سو وقت پہلے ہاتھ جبر کا مردِ دل  
 ایسا ہی نہ تھا۔ انہیں پہنچتی جس وقت؟ سوامی جی کے سر سے یہ سارا ہم سے کیا معلوم  
 ہوتا تھا؟ کوئی ہم نے دیا؟ بے پایاں میں غوطہ لگا رہا ہوں اور کواں لہرِ داغ و خونِ کسی  
 پر زورِ کُشتی سے کھینچا ہوا چلے جاتا تھا۔ جیسے کوئی شتی، ہوا کی زوئیں لگا کر تھک کر رہ  
 جاتی ہے۔ یہی کیفیت اُس کے ہو رہی تھی۔ کلمہ پڑھا، اُٹھ چلا آ رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی  
 کہ میری یہ حالت کیوں ہو گئی ہے؟ جس وقت عیش کی کشش کا اُس سے کچھ ترہ ہو چکا تھا  
 مگر اس وقت مجاہد کا جو پُرسور و غلبہ اُسکی روح پر ہوا تھا۔ وہ خیال اور فکر اور تیز  
 کے انما نہ سے سے باہر تھا۔

مگر یہ کیفیت صرف پرتاپ ہی کی نہ تھی۔ منشی جی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ سوامی  
 برہمانند جی کی پُر نور آنکھیں بھی اب گدگد ہو گئی ہیں اور اُن کے روشن چہرہ پر جو سُردراؤ





میں آئیں جو الہ آباد کے کتب خانوں میں بھی نظر نہ آئی تھیں۔ یہ ان زائرین کی یادگار ہے جو وقتاً فوقتاً یہاں آئے تھے اور جب سمجھی دنیا کے کسی حصہ میں کسی ہیئتہ علم پر کوئی معرکہ کا کتاب لکھی جاتی تو خود مصنف یا سوامی جی کا کوئی معتقد اسے ضرور یہاں بھیج دیا کرتا۔ ایک بادشاہ تھا کہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دروازے کے مالک سے علم و تحقیق کے خراج لیا کرتا تھا۔ مادی سلطنت، ایک محدود شعبہ مگر یہ حلالی سلطنت دنیا سے بھی زیادہ وسیع اور وسعت سے بھی زیادہ فراخ ہے۔ تخت و تاج کی فیکری یاد دہی کے سادہ کوئی ہستی نہیں۔ پرتاپ چمن نے اپنی عقل و ذہن کا دامن اس علم و ہنر کے کان سے خوب آزمادی کے ساتھ بھر اویڑ دیا۔ کئی زبانوں کا بھی ماہر ہو گیا۔

پانچ سال بزرگ ہو گئے مگر میری عمر بڑھ رہی تھی۔ کہہ اور دیا نے گرمی سے تگ تگ کر کے سینہ بلباس اتارنا شروع کر کے تھے۔ آسمان کا بندھن آگے نہیں آتا تھا۔ ہوا کا ہوا اس طرف سے قریب سے بالی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک روز پرتاپ چمن گیارہ سو برس کے انسان کی طرح مراد علی میں سرخوش تھا کہ سوامی جی نے سستی سمجھوانا شروع کیا۔

میرے چچا ہیں بالاجی کو اب یہاں زیادہ کچھ رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کئی دن سے سوچا کہ اول کہ انہیں شخصیت کہ وہ میرے لئے کچھ ایسی محنت ہر سو سال کا خیال ملتی نظر آئے۔ آپ کے میری اس کمزوری پر عجیب ہوتا ہوا فکر میں آئے آپ کہتا ہوں کہ پرتاپ چند میرا بیٹا ہے۔  
**سمجھوانا لال۔** (حیرت سے) ایں۔

سوامی جی۔ اسی خیال سے آپ میری کمزوری کے قابل سمجھیں۔ پہلے ہی جب میرا نگاہ اس کے چہرہ پر پڑی تو پرانی محبت تازہ ہو گئی۔ او میں مضبوط و استقلال سے کام

لیتا تو یقین تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور آواز اٹھا ہو جاتا۔ آج کچھ نہیں  
 مل کر دے جب میں نے دنیا سے منہ موڑا اسوقت کی تصویر آج بھی میری نگاہوں  
 پہنچی ہوئی ہے جب میں شام کے وقت سبام سے رخصت ہوا ہوں پرتاپ چھ  
 ماہ کا بھی نہ ہوا تھا۔ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا میں نے اسکی طرف آنسو بھری  
 نگاہوں سے دیکھا اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا مگر برائے ملک کے سوا اور کون جان سکتا ہے  
 اسے کچھ خیال سے دوسرے کے لئے میں نے کتنے فیصلے اور حرکتیں کام لیا۔ برسوں تک  
 وہ اسکی مومنہ رہی۔ آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی۔ بالے ایشور کی دیا سے میں  
 نفس پر غالب ہوا اور اٹھارہ برسوں تک پرتاپ ایک لمحہ کے لئے بھی میرے  
 خیال میں نہیں آیا گھر جوں ہی آپ کے ساتھ آئے دیکھا پرائی یاد تازہ ہو گئی۔ مجھے  
 پتہ دیر لگ کر گھنٹہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب یا ایک ماہ میرے دل میں گزرتا نہیں ہو سکتا  
 یہ بالائی نے یہاں یہ غور و رجحان کر ڈالا میں اتنے دنوں سے یوں۔ سارے عرصے تک بھی  
 جا بیک نہ دیا۔ ان ہوں۔ یہ تعلق محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہوتا ہے اور ایک  
 پتہ دیر لگ کر کوئی بھی اس تعلق کو نہیں ٹوڑ سکتا۔

جیوین ال۔ وہاں لاج آپ نے جو کچھ کر دکھایا، مجھے مجھے سے کم نہیں رہا  
 جیسی دیو پرتاپ حبیب، بیٹا ہر شخص نہیں تیاگ سکتا۔  
 دماغی جی۔ مترتیب سب ایشور کی رچنا تھی مجھے شرف ہی سے اپنے بھائیوں کی بھائی  
 کا خیال آیا ہو گیا تھا اور جو کچھ میرے لئے ہو سکتا تھا اس کی کئی خدمت کرتا  
 رہتا تھا مگر یہ لی آرزو تھی کہ ایشور میرے گھر میں دینی قوم کا فدائی پیدا کرتا۔ ایشور  
 سے ہمیشہ ہی پراپت تھا کیا کرتا۔ آخر لکشمی جی نے سب ماگو دیشن دیا اور سبام نے

مہارانی سے منہ ملا کر بردان پایا۔ اسی رات کو مجھے بھی دیر لگ کر سنا لیا۔  
 سچوین لال - لیٹور کی لیلہ اپا ہے۔ اگر مہاراج ویر لگ نہ پلے تو بلا جی آج  
 کی سزا لیتے۔

سوامی جی - بالاجی ابھی تہ پر نہیں پہنچے ہیں اور نہ میں، انہیں جتنا مناسب سمجھ  
 نہیں در نہ وہاں سے جانا کرگز منظر دہ کر لیں گے۔ دیکھو، اس تھوڑی سی  
 میں ماہنوں نے کبیرا حیرت انگیز کام کیا ہے، اس میں ایسا ضبط و لوگ بیز  
 نہیں دیکھا۔ مجھے غور ہے کہ میں ایسے پیٹے کا باب ہوں۔

سچوین لال - پچھلے دنوں کوٹ پٹنہ نام کے گھروں نے راج ریت پر جو  
 کیا اسے رکن میں حیرت میں آگیا۔

سوامی جی - یہ کوٹ علماء میں سرآمد و نگار سمجھے جاتے ہیں۔

سچوین لال - مجھے انکا میں ایک ہزاران سے لے کر اتفاق ہوا تھا۔

سوامی جی - خبر عام تھا کہ ایسی چیز ہے جو شوق و شغف سے موز پر ز ترقی پاسکتی ہے۔

اسوقت بالاجی کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر کے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا

ہوں کہ انکے تلیس کروڑی تو نہیں باقی ہے مجھے خبر یہ ہے کہ بعض آدمی ملت

ویراک میں اپنے کچھ بکلاک ناگتہ نہ کمزوریاں کر بیٹھے ہیں خصوصاً اس

کیا ہے کو دنیا میں ہوا اسے لگ ہے کا حوصلہ دکھتا ہوا انتہا و جب کے مضبوط دل

منہ پر ہم لو آپ اس کو خلو میں بیٹھے ہوئے دنیا کی گراہیوں اور لغزش

سے بچ رہ سکتے ہیں مگر بانی پر کھل بن جانا اس سے ہر جہاں مشکل ہا سکتے۔

سچوین لال - مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی دنیاوی طاقت بالاجی کو فرسودہ حق کے

راست بہ نہیں پھیر سکتی۔

سوامی جی، خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے مگر یقین جیسا ہی ہو سکتا ہے جب ایک بار انہیں آزمائوں میں تو کچھنا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ ضبط اور ترک ادا ہی ہوگا طبیعت ثانی قوم کی خدمت پہلے تو ایک تنہا معلوم ہوتی ہے مگر دنوں کے ساتھ ناقصائے قوم کا ظاہری اعزاز و اقتدار ٹھنڈا پاتا ہے یہاں تک کہ اس کے بددربار و شاہوں کی گردنیں بھی بھگتے لگی ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ پتھر بھی نہیں شیر پر منہ کے سامنے کبھی نہیں بھبکیں دے گئے گھما کے ایک پیالہ سے سر ہونگے میں اور جو بل سختوں اور افسوں کے طوفان سے بھی نہیں دے وہ مداحات و عنایات کی خوشگوار آواز ہے۔ یہ نہ سننے والے کے

پھیوان اللہ! اس کا امتحان کیونکر ہوگا؟

سوامی جی، ہم اور آپ ملکر بالہ جی کے نفس پر زور دالیں گے۔ آپ کو اس لئے شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میں تنہا غالب نہ آئی آتما پر کچھ اثر نہ پہنچا۔ کونگا۔ انہی لوگ شکرت ان دلوں بہت بڑھی ہوئی ہے۔

پرتاپ چند گمان سرور کے کنارے اپنے خیال میں مکن بیٹھا ہوا تھا کہ اسے — کچھ غنڈہ کی سی معلوم ہوئی اور حنائی اس کے اندر گھلس لے چونک کر آنکھیں کھلیں، اپنے خیال کو سمجھ کر ہنسا، تھوڑے دیر بعد اس پر پھر غنڈہ کی کاغذی ہوا اور انہیں جھپکنے لگیں۔ جسے کوئی بات بھر کا ہوا، سو لادھی صبح کے وقت غنڈہ سے متوالا ہو جاتا پرتاپ کو تعجب ہوا کہ آج مجھے اتنی غنڈہ کیوں لگی ہے اس نے پانی کے پھینے مرنے پر دے دیا میں نے غنڈہ راہ کر لیا کہ اب غنڈہ مرنے نہ دے دوں گا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا

تھا کہ چھوٹی کیفیت ہوئی۔ آنکھیں خواب گرائیں مجھ پر مگر منہ نہ لگیں اور انگڑائیوں کے  
 مائے اعضا ڈھنسنے لگے۔ پرتاپ کی سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ وہ  
 اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک تیزی سے ٹہلتا رہا۔ بعد ازاں اپنی جگہ پر بس بیٹھا۔

اس طرح نیند نے اُس کو سمجھنا کام حملے کے ایک ایک برزور کے ساتھ ساتھ حملہ پرتاپ  
 سے برداشت ہو سکا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن جھک گئی۔ اُس کی آہٹا اہلی بار مغربی  
 مدینہ کا غلبہ ہوئے ہی پرتاپ چند کہ ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی پر فضا یا زمین  
 اٹھ گیا ہوں۔ عین زیر ہوا میں چل رہی ہیں اور ہر ایک رخت پر خوشبو اور شیریں نوا  
 چڑیاں بھی چبک رہی ہیں۔ ہوا میں کچھ ایسی فرحت ہے، طبع کی شیریں نوائیوں میں وہ  
 منہ انہن اور ہڈیوں کی ہلکتی ہے، نشہ کہ دل و دماغ متوالے ہوئے جلتے ہیں۔ بہار  
 اپنی دلچسپیوں کے پورے سامان لیا ہے۔ پہنچ رہی ہے۔ یہ سب سچ ہے نہ میں اس جنت کد  
 میں کو کمر آ پہنچا ہوں۔ بھی تو میں گمان، سرور کے کہے سے بیٹھا ہوا تھا کہ میں خواب تو  
 نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب جگر اُس نے آنکھیں بھرا بھرا کر دیکھا اور نہ یقین کر لیا کہ یہ  
 خواب نہیں ہے۔ سرور میں جھٹک کر کسی کے باغیچے میں چلا آیا

وہ! ہر اُدھر روشن میں ٹہلنے لگا کہ دشت ایک تاریں سیاہ اور درختوں  
 کی آڑ سے خولام خولام آتی ہوئی دکھائی۔ اس پر حُسن کا روپ تھا اور درخت کا  
 سنگار۔ وہ روشنی کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی۔ پرتاپ بہتہ کہ دیکھ رہی وہ کس کی اور  
 چشم پریم سے دیکھ کر بولی: "پرتاپ"

پرتاپ چہلنے سے پہچان لیا۔ و برج رانی تھی مگر اس آہ گل کی برج  
 سے بدرجہا حسین و تجیر ہو کر لولہ "برج! تم یہاں کہاں!"

برج رانی۔ جہاں تم ہو وہاں میں بھی ہوں۔ محبت نے تمہارا پتہ دیا۔ اگر تم ملک  
بندر بھی چھو لوں میں سما جاتے تو میں تمہیں ڈھونڈھ نکالتی۔ تمہیں شاید معلوم  
نہیں۔ میں نے دوسرا جہنم لیا ہے۔

پرتاپ۔ (حیرت سے) دوسرا جہنم۔

برج رانی۔ ہاں ابکی میل جہنم دیو لوگ میں ہوا ہے مگر یہاں بھی جیسے ہوش بسٹھا لگا ہے  
تمہارے بیگ میں گھل رہی ہوں۔ یہ میرے باپ کا بارغ ہے تمہارا امتحان  
یہاں سے بہت قریب کہ تمہیں معلوم نہیں مگر میں دن میں کئی بار تمہارے درشن  
کرتی رہی ہوں میرے بھاک اچھے تھے کہ اس لوگ میں جہنم ہوا۔ ایشور نے  
شاید میری آنکھوں میں پوری کر لئے کے لئے مجھے تمہارے ہوش میں بھیجا ہے۔

پرتاپ چند۔ برج! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ میرا تم  
سے ہمیشہ پاک تعلق رہا ہے۔

برج رانی۔ پیارے۔ ان خیالوں سے میرے اچھلے دل کو تسکین نہیں پتی۔ پریم کی  
آگ نے ان سب خیالات کو جھلکھٹا کر دیا ہے میں نے خیال کیا تھا کہ تم نے نظروں  
سے دور ہو جانے کے تو دل تمہیں بھلا دیگا۔ میں نے دل کو بہت سمجھایا۔ مدد  
شعرو سخن سے جی پہلاتی رہی۔ تم آج بھی لوگوں کو میرے کلام کا طراخ پاؤ گے  
میں نے شہرت اور عزت اور دولت سب پائی اور سب سے جی سیر ہو گیا مگر تمہاری  
محبت کا نقش دل سے نہ مٹا۔ دوسرا جہنم لیکر بھی اسی آندو میں گھلتی رہی میں  
برسوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی داستانِ غم سناؤں یا نہ سناؤں۔  
کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر محبت میں روحانی طاقت ہے تو ہم اور تم ضرور ملینگے

— کبھی سوچتی کہ تم مجھے بھول گئے ہو گے مگر دل کو کسی طرح نہ سمجھا سکی۔ آج مجھ کو یہ کہہ  
میں نے شرم و حیا کو طاق پر رکھا اور تمہارے سامنے کھڑی ہوئی۔ تم میرے لئے جو فیصلہ متناہ  
سمجھ رہے تھے میں تمہاری بھول غماہ مجھے اپنے پہلو میں جگہ دو خواہ خیال میں بھی نہ لاؤ۔ میں تمہاری  
سیلو میں رہ کر تمہارے ساتھ سب کچھ سہنے کے لئے تیار ہوئی۔ میرے پتا اس لوک کے  
راہ میں میرے سوا ان کے کوئی اولاد نہیں مگر میں سب تیاگ دیتی۔ میں تمہارے ساتھ  
فلتے کرونگی۔ کنویں سے پانی کھینچوں گی۔۔۔۔۔

یہ کہتے بہتے برجی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور نگار روندا ہوا گیا  
پرتاپ چند عجیب محض میں مبتلا تھا۔ برجی نے اُسکی محبت کا رنگا گایا تھا اور  
یہ اگل سکر ایسا اکون مرد ہے جو علم و روش نہ ہو جائے و ذرا دیر کے لئے بالکل بے کیف ہو گیا۔  
سوچنے لگا کہ ایسی سچی محبت کیسے غیر فانی۔ کیسی پاکیزہ کیسی بے غرض! برجی تو سچ بچ  
دلوی ہے۔ ترانہ سنان کی دلوی تھی اب یہ تو ناؤں کی دلوی ہے تو میرے لئے یہ بہشت اور  
یہ دولت اور یہ سکھ تیار کئے گئے! میں کیسے تیری آن محبت کی داد دوں میں تجھے کیسے تبرا  
دوں کہ یہ دلان قربانیوں کے لالچ نہیں ہوں۔

پرتاپ چند انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اتنے میں برجی نے نہرکست سے اُسکا  
ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: ”پاپے میں نے تم پر فیصلہ چھوڑ دیا مگر دل کا نپا ہا ہے کہ کہیں  
بے وفائی نہ کر بیٹھو (ہاتھ جھٹک کر) ایسا نہ کرنا! نہنیں تمہاری برجی مر جائیگی میں تم  
سے کچھ نہیں مانگتی میں تم سے محبت نہیں مانگتی میں تمہارا دل نہیں مانگتی میں تم  
سے تمہارے ساتھ نہ ہونگی۔ تمہاری خدمت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔ اس نیلا  
میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ تمہارا دل میرے مان کا نہیں۔ اُسے لینے کے لئے میرے پاس کچھ



ہیں ہے۔ میری محبت پر غرض ہے جس و شباب چند روزہ۔ دولت فانی۔ تمہاری محبت غیر محدود ہے.....“

پرتاپ چند کے جی میں آیا کہ اس لڑکی کے قدموں پر سر رکھوں و کچھ جواب دے سکا۔ برجن کی روحانی عظمت نے اسے بالکل پست کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ اس خود فراموشی کے عالم میں اپنا رت بھول جائے مگر کانک سوامی پرھماندی کا یہ قول اُسے یاد آگیا:-  
 ہنس نیک اور اعلیٰ کام کے راستے میں بڑے بڑے سخت امتحانات کا سامنا ہوتا ہے، پورا دم دے جان امتحانات سے بے دل نکل جائے بسا اوقات یہ امتحانات ننگ و پیل کر کے لے ہیں اس وقت ان سختیوں کو بردھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس قول کے بعد اُس نے ہی پرتاپ کا خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ضرور میں اس وقت امتحان میں پڑا ہوا ہوں۔ میری طاقت جو مجھے سا پرکھ رہی ہے برجن کی زبان میں بھی اپنا داد و چلا رہی ہے یہ خیال مجھے اُٹھنے لگے جواب دیا۔ ”برجن۔ مجھ میں یہ بیان کرنے کی طاقت نہیں کہ اس وقت تم سے ملکر طبیعت کیسی خوش ہوئی ہے مجھے غمزہ ہے کہ تم جیسی پاکیزہ اوصاف لڑکی مجھ سے مل جیت رکھی ہے اس محبت کے مقابلہ میں میری ہستی کی کچھ وقعت نہیں۔ کامش میں اس قابل ہوتا کہ اس کا تھکا پھار کی کچھ قدر کر سکتا۔ مجھ جیسا مٹی کا انسان تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہاری پرستش کر سکتا ہوں مگر محبت نہیں۔ میں تمہارے قدموں کی خاک کو پیشانی پہل سکتا ہوں مگر تمہاری محبت کو اپنی بشریت سے آواز نہیں کر سکتا۔“

برجن لڑکی کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ نکلا ذرا دیر کے بعد بولی:- ”تمہارا فیصلہ مجھے

بہر و چشم منظور ہے ایشود تمہیں یہ سب کر دے۔ یہی میری دعا ہے۔ میرے لئے یہی خوشی کافی ہے کہ میری عزت اور محبت تمہارے دل میں موجود ہے پرتاپ لقمین ملا میں صدق دل

سے اپنی خود غرضی پر نام نہوں محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ یہ اس تقاضا ہے۔ حالانکہ میں تمہاری محبت کی طالب تھی۔ میری یہ خواہش نہ تھی کہ تمہاری محبت پہلے تنگی لوگوں خیر نوشتہ تقدیر سے کیا چلے! میری آخری التجا یہ ہے کہ اب میری یاد اپنے دل سے کال لٹاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت میری یاد تمہیں ستائے اور لائے۔ کیا تم روئے ہو میرے روضہ موت۔ البتہ کے لئے اسپینے اور ایسا ظلم نہ کرو ورنہ پرتاپ بچھتاؤ گے۔ تمہیں تحریر ہو جائیگا کہ قوم کی خدمت اور قوم کی محبت دل کے لئے کافی غلام نہیں ہے۔ تمہیں عصب کچھ ملے گا مگر بوجہ نہ ملیگی۔ مجھے پرامن نہ تھا کہ لے لے پیا کیلے اسے کیا جواب دو گے؟

پرتاپ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”برجن میری پر تکیست توڑو۔ تمہارے روبرو کھڑا ہوں میں اپنے ریت پر تکیا نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنے شخصیت کرو میں جیت کے نہ ہوں گا۔ تمہاری پریش کرتا ہوں گا۔ تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔“  
یہ کہتے کہتے دفعتاً اس کے اُسکی زبان بند ہو گئی۔ بہت گھبراہٹ ہوئی کہ وہ اپنے اُسکا دلنا بند ہو جاتا ہے۔ برجن نے سر جھکا کر اس پر نام کیا اور نظروں سے غائب ہو گئی۔  
شام کا وقت تھا ہمارے سر پر سہرا تاج لکھ کھڑا تھا۔ چڑیاں بے لے رہی تھیں آسمان پر سے دو ایک شہر خنظر تارے کھڑے لے لے تھے پرتاپ نے اپنے دیکھا کہ برجن گیاں سرود کے نیلگوں پانی میں کھڑی ہے۔ گویا اہل دیوی اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہے اور ایسی آواز سے جیسے کیر کی کوک پیلیہ کی ہو کہ اوشیا ما کی جہک ملی ہوئی ہے یہ لہو نعمت الپ رہی ہے۔

بن ہری کیوں را کہیں من دھیر

گھر آگن نہ سہات رہن دن - بسرے بھوجن نیر  
 بن ہری کیوں را کھیں من دھیسہ  
 مچھلیاں روتی تھیں اور پیر پتے سر دھنتے تھے۔ برج مکر تک پانی میں  
 چلی گئی اور پھر یہ آواز آئی ۱۔

پن پن دہی مورت آوت : چت چوت جہنا تیر  
 بن ہری کیوں را کھیں من دھیسہ  
 برج نے پر تاپ چند کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے پھر گلے تک پانی میں چلی  
 گئی۔ ایک کھل کھل گیا۔ یہ آواز آئی :-  
 مت اچس آہو سر اپنے۔ کھن ملن کی پیر

بن ہری کیوں را کھیں من دھیسہ  
 چند تارے کان لگائے سن رہے تھے۔ آسمان کی مورتی مٹ جاتی تھی  
 برج نے پر تاپ چند کو پر نام کیا اور پانی میں غوطہ لگایا۔ پھر نہایتی کا جھانڈا کھینچے  
 دیکھتے دُوب گیا۔ پر تاپ دوڑا پیر لڑکھڑکے اور بیہوش ہو کر نہین پر گر پڑا ۲۔

## گنگا جمن کا ملاپ

ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیر مانوس نہ گئے جس طرح ایک گریزہ کسی پرفون کاریگر کے یا تختوں میں موتیوں کے تول بکنے کے قابل ہو جانا ہے۔ اسی طرح برج رانی نے مادھوی کو سکھا کر صا کر اپنے ہی سا بنا لیا تھا۔ اُسکی خلقی نیک مزاجی اور شرافت کی دو ایک مثالیں برج کے ان خطیط میں ملتی ہیں جو اُس نے جوگاؤ سے لکھا۔ چنانچہ مرحوم کے نام لکھے تھے۔ کبھی کبھی جنگلی بھینسوں میں ڈوبنا اور رنگ روپ ملجائتا ہے جو سچی ہوئی روشنیوں اور صق کیا ایل کو کبھی پیسٹر نہیں ہو سکتا۔ مادھوی علی قادیان غریب جاہل برہمن کی لڑائی گرفتار تھے اُسے جس قسم کے دل پہنچا وہ وصاف عطا کئے تھے اور اُس میں تعلیم و تربیت قبول کر لے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی یا وہی اور برج کا ملاپ سوقت ہوا جب برج سسرال آئی۔ اس بھولی بھالی لڑکی نے اُس وقت سے برج کے ساتھ غیر معمولی محبت ظاہر کرنا شروع کی بعد ازاں نہایت سے دیسی تھی تھی یا کہ اگر کبھی اس نے برج کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ برج بھی اُسے اپنے ساتھ سلالتی۔ کھلاتی اور اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہناتی اس سے زیادہ محبت و اپنی چھٹی جن کی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دل کو دل سے لگاؤ ہوتا ہے۔ برج کو سسرال میں آنے کے بہت پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ میں ہی پرتاپ چند کے خوالوں کی پری ہوں۔ اُسکی ایک نظر

میں ایک ایک بات میں وہ اپنی محبت کی جھلک دیکھتی اور انہیں کہتی۔ ایک دوسرے جیکہ وہ مکمل چرن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اسے یہ خیال کر کے رونا آیا تھا کہ میری تویوں لطف سے گزرتی ہے ابھیچاے پر تاپ کے دل میں نہ جانے کیا ہیبت نہی ہوگی۔ مادھوی اس وقت گیارہویں سال میں تھی اور اس کے رنگ زہد کا لکھارہ سلیقہ گندگوار گن دیکھ دیکھ کر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ برجی کو محال خیال یہ آیا کیا میری مادھوی اس قابل نہیں کہ پر تاپ اسے اپنے گلے کا ہار بنائیں۔ اس دن سے وہ مادھوی کی تربیت اور غلط داری میں اور بھی زیادہ متہمک ہو گئی۔ وہ سوچ سوچ کر دل میں پٹی نہ سمجھتی کہ جب دینا سولہ سترہ سال کی ہو جائیگی اس وقت میں پر تاپ کے پاس جاؤں گی اور اس سے ہاتھ جوڑ کر کہوں گی کہ مادھوی میری بہن ہے اسے آج سے تم اپنی چیری سمجھو۔ کیا پر تاپ میری بات ٹال دیں گے؟ نہیں ایسا وہ نہیں کر سکتے مزہ تو جیسا کہ خود مادھوی کو چچی اپنی بنائے کی مجھ سے استاد مانگیں۔ اسی خیال سے برجی نے پر تاپ سے کہنے اور آئندہ کا نقشہ مادھوی کے دل میں بنانا شروع کر دیا تھا تاکہ اس کا دیوانہ دیوانہ پر تاپ کی محبت میں سرشار ہو جاوے۔ وہ جب پر تاپ کے کھان کمرے تک گئی تو زور بخیز اس کے الفاظ غیر معمولی طور پر شیریں اور فصیح ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ مادھوی کا چچہ دل پر اپنی اُلفت کے مزے لینے لگا۔ آئینہ میں بال پر گیا۔

بھولی مادھوی سوچنے لگی میں کیسی خوش قسمت ہوں مجھے ایسا سہمی مل گیا جس کے پیر دھولنے کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ مگر کیا وہ مجھے اپنی چیری بنائیں گے؟ کچھ ہونے چاہئے ان کی رانی سونگی اور یہ میں کچھ کچھ ڈوبے تو میں انہیں ضرور اپنا لؤں گی۔ مگر اس غریب کو کیا معاملہ تھا کہ یہ آندویش حسرت بن کر آنکھوں کے راستہ بہہ جائیگی

اُس کا پسند ہوا اسی سال پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ برجن پرغانہ بتا ہی کے صدمے آئے  
اس طوفان کے جھونکے نے مادھوی کی اس خیالی پھلواری کا مستیاناس کر دیا اسی  
اشنامیں پرتاپ چند کے لاپتہ ہونے کی خبر ملی۔ طوفان نے جو کسر رکھ چھوڑی تھی وہ  
اس آگ نے جلا کر رکھ کر دی۔

مگر خیال کوئی چیز ہے تو مادھوی پرتاپ چند کی بیوی بن چکی اس نے اپنا حق  
ادمن انہیں سونپ دیا۔ پرتاپ کو خبر نہیں مگر آنحضرت ایسی بیڑ، بہا چیز ملی ہے جس کے  
مقابلہ میں دُنیا کی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ مادھوی نے صرف ایک بار پرتاپ کو دیکھا تھا  
اوصاف یہ کیا۔ اُسکی اہستہ کی سی باتیں سنیں تھیں مگر برجن کی شہر میں بیانیوں نے اُسے  
سینہ میں آگ کی وہ چٹا گڑی ڈال دی تھی جو رُغی کے تڑپ میں غصہ کیا۔ جلا کر نکلتا  
کر دیتی ہے۔ پرتاپ پتہ نہیں ہے مگر مادھوی اُسکی تصویر مجھ میں نہ رہی وہ لگتی جاتی ہے  
اس دن سے دن ایسا سرت نہیں تھا جو مادھوی نے دیکھا ہو کوئی ایسا دیوتا نہیں تھا جسکی  
ڈالو پناہ کرتی ہو اور سب اس پر نہ پرتاپ پسندو ایسے یہاں کہیں بھی ہوئے نہ رہتے رکھے۔  
اس خیال کا کہ اس لڑکی کو ابھی تھانہ متین۔ ایک مزار اور شہادہ بڑا دیا۔ شاید اُس نے  
دس فیصد لیا کہ اگر میرا بیٹا پرتاپ چند سے ہو چکا۔ برجن اُسکی چھات و چھتی اور وہی کہ  
یہ آگ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ اب تک اُس کیسے کھلے ہمارے یہ آگ کسکی ہو کہ سبکی ہو  
جس پر سب کو میں نے اتنی محنتوں لگایا اور شہادہ دودھ سے ستیا۔ اُس کا یہی اس طرح  
شاخ پر کھلا یا جتا ہے برجن تو خیر شہر دس میں اُلجھی رہتی یہی باغیچہ اُس کا بہرام او  
پونے اس کے خوش تھے مگر مادھوی کو شہر خلع کہاں۔ اُس کا مولش اور بہرام صرف خیال  
یا تھا۔ اُس کا یاد جو اب تک اُس نے بھگتا نہ محض تھا ایک روز پرتاپ کے چلے جانے

کے بعد مادھوی نے خواب دیکھا کہ وہ سنیا سی ہو گیا ہے۔ آج مادھوی کا اتھاہ پریم نظر ہوتا ہے اسے اب ہم سا ہو گیا کہ پرتاپ نے ہنرور سنیا س لے لیا۔ آج سے وہ بھی تیسویں دن گئی۔ ذاتی آرام و آسائش کا خیال دل سے جاتا رہا۔

جب کبھی بیٹھے بیٹھے مادھوی کا جی بہت گھبراتا تو وہ پرتاپ چند کے گھر جا بیٹھی وہاں اس کے دل کو ڈاڈیر کے لئے تسکین ہو جاتی تھی جو بے سبامہ کو برجن کے خطوط کا پتہ ملتا تھا۔ اس کی زندگی نے عجیب نشا اختیار کر لی تھی غور و خوض کے اوصاف ناکرکن خاص تھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر بل تھک لئے دیا تھا۔ بلکہ اسنو ملال کا ایک لفظ بھی نہ لکھنے دیا۔ اس آٹکھوں سے حسرت کے آنسو بچنے پلٹے۔ حسب معمول ٹھیکہ کا کاروبار کرتی رہی بلکہ اب وہ بھی مصروفیت کا انہماک کے ساتھ ہاں اب بجائے فزیدہ کفایت شعاری کے مزاج میں نہ اٹھتی آگئی تھی۔ یہ مکان مادھوی کے لئے ایک پاک مندر تھا۔ جینک برجن اور بڑا کے دوسرے گھر پر پڑی ہوئی تھی وہ یہاں بہت سم آتی تھی۔ جینک برجن کا رہنے کی کینہ شاعری۔ یکایک خیالات اور پاکیزہ طرز زندگی نے دونوں عورتوں کے دلوں کی گانچ کھول دی اور نہ کا جسمانی طرح باہم گلے مل کیں تو مادھوی نے آدورنس بھی بڑھی۔ سب کے اس دن کے دن سمیٹ رہی جاتی۔ اس گھر کی ایک ایک چیز میں پرتاپ کی یاد کی یاد رکھنی ایسی آواز میں بالاجی نے کاٹھ کے گھوٹے دوڑائے تھے اور اسی صحن میں کاٹھ کی آدور چلتی تھیں نازیں تو شاید سنانہ کے جھنور میں پڑ کر ٹپ پٹ مار گھوڑا اب بھی موجود تھا۔ پلٹے اس کی بوسیدہ ٹیول میں حیاں ڈال دی اور اسے باغیچہ میں حوض کے کنارے ایک گلاب کے سایہ میں باندھ دیا۔ یہی کمرہ بالاجی کی آرام گاہ تھا۔ مادھوی نے اب اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی ہے اسی پلٹے بالاجی کو منڈوں تک اپنے

آغوش میں تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ مادھوی اب اُسے پھولوں سے سجاتی ہے کیا  
 پلانگے ایسے دن بھی دیکھے تھے۔ مادھوی نے اس کمرہ کو الیسا آراستہ کر دیا جیسا وہ  
 کبھی نہ تھا۔ تصویروں کے چہرہ پر سے گرد کا ثقاب اُٹھ گیا۔ لمبے لمبے نصیب پھر روشن  
 ہوئے۔ مادھوی کی اس ہمہ گیر محبت سے سُباما کا کفر بھی ٹوٹ گیا۔ مدت سے اسکی زبان  
 پر پرتاپ چندہ کا نام کبھی نہیں آیا تھا۔ برجن سے میل جول بھی ہو گیا۔ مگر دونوں عورتوں میں  
 کبھی پرتاپ کے ذکر نہیں آیا۔ حیا برجن کی دامنگیر تھی اور خود اسی سُباما کی مگر مادھوی  
 کے شعلہ محبت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا۔ جب ایک خود فتگی کے عمامہ میں پرتاپ  
 بچپنی باتیں پوچھنے لگی تو سُباما سے ضبط نہ ہوتا اُس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ تب  
 دونوں عورتیں او دن دن بھر اُنکی باتیں ختم نہوتیں۔ کیا اب بھی مادھوی کا  
 حال دل سُباما سے چھپ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ کیا یہ تیسرونی لوں ہی محبت کی  
 آگ میں جلتی رہی اور بلا کسی اُمید کے!

آٹھ نو سال بیت گئے۔ ایک زہر جلائی نے مکمل کا پیکیٹ کھلا تو مردق  
 پر ایک نہایت پر ہللا تصویر کئی رنگوں میں بنی ہوئی نظر آئی۔ یہ کسی مہا تما کی تصویر تھی۔  
 اُسے خیال آیا کہ میرے ان مہا تما کو کہیں ضرور دیکھ رہے۔ سوچتے سوچتے یکایک  
 اُسکا خیال پرتاپ چند تک جا پہنچا۔ فرط مسرت اُٹھیل پڑی اور بولی :- مادھوی  
 ذرا یہاں آ جاؤ۔

مادھوی پھولوں کی کیا بیاں سنا رہی تھی۔ مِس کے دل پہلاؤ کا آجکل مہی مشغلہ  
 تھا۔ ساٹھی پانی میں لت پت۔ سر کے بال کھیرے۔ ہاتھ پر پسینہ کی بوندیں۔ آنکھوں میں  
 پریم کا رس۔ آکر کھڑی ہوئی۔ برجن نے کہا: ”آجھے ایک تصویر دکھاؤں“



مادھوی کسکی تصویر ہے۔ دیکھوں۔  
مادھوی نے تصویر کو بغور دیکھا اور آبدیدہ ہو گئی۔

برجن۔ پہچان گئی۔  
مادھوی۔ کنوں؟ یہ شکل میں کئی بار خواب میں دیکھ چکی ہوں چہرے سے تاج برس لہا ہے  
برجن۔ دیکھو کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔

مادھوی نے دوسرا ورق الٹا تو ”سوامی بالاجی“ کی سُرخ نظر آئی۔  
عقڑی دیر تک وہی دونوں خاموش۔ محویت کی تصویر بنی ہوئی یہ مضمون پڑھتی  
رہیں۔ بعد ازاں بات چیت ہونے لگی۔

برجن۔ میں نوپلہ ہی سمجھ گئی تھی کہ انہوں نے ضرور سنسیاس لے لیا ہوگا  
مادھوی۔ زیریں کی طرف تائی رہی منہ سے کچھ نہ بولی۔  
برجن۔ تب تو اب میرا کتنا فرق ہے، چہرہ پر ہلال برس لہا ہے تب تو دیکھ رہے تھے۔  
مادھوی۔ ہوں۔

برجن۔ ایسا کئی لوگوں نے رُتی پیسی کی ہے (آبدیدہ ہو کر) کیا اتفاقات ہیں تم اور  
ساتھ ساتھ کھیلے ساتھ ساتھ تھے۔ سن و سنسیاسی ہیں اور میں میرا سن نہ جانے انہیں  
ہم لوگوں کی کچھ سُنھنہ ہے یا نہیں جوں سنسیاس لے لیا اُسے کسی سے کیا ناظرہ جیہ  
جی کے پاس ایک خط لکھا تو جلا ہماری یاد کیا باقی مادھوی! پچھلے میں  
کتنی جگہ جگہ کی جیلے تو میں مٹھائیوں کی بھکشا دیا کرتی تھی۔

مادھوی نے رو کر کہا۔ ”نہ جانے کب درشن ہو گئے“۔ یہ کہہ کر شرم سے  
سر جھکا لیا۔

برجن۔ اُنکے جلد۔ راجہ دھرم سنگھ اُو بھیا دونوں انہیں ضرور لائیگے  
 مادھوی۔ ان دونوں آدمیوں نے بھی بڑے حوصلے کا کام کیا ہے۔  
 برجن۔ کیسا کچھ! راجہ صاحب یہاں سے گزرتے گئے تھے۔ شاید خطاب کی اور نہ کھینچ لی گئی  
 تھی۔ اُنکی جائیداد دو ڈھائی کروڑ سے کم کی نہیں۔ پچاس لاکھ تو سالانہ نفع ہے اُن کا  
 اس فراخ دلی سے ساری جائیداد کا ذخیرہ بن گئے کر دینا اُو اس کما حقہ ساتھ اپنی  
 زندگی بھی ایسے کر دینا بڑا بھاری تنگ ہے۔ بھیا نے بھی گل کا نام روشن کر دیا۔  
 مجھے اُنکی طرف سے ایسی امید نہ تھی۔

مادھوی۔ چند راہیں آتی ہوگی  
 برجن۔ ہاں ابے ہاں کیا کریگی۔ انہیں بھیا کا یہ کام شاید ہی پسند آیا ہو۔ جھللاتی  
 ہوئی آتی ہوگی۔

مادھوی۔ درشنوں کو لوگ بہت دُروڑ سے آئے تھے۔  
 برجن۔ تقریر کی کسی تعریف کی ہے اُنکی زبان میں تو پہلے ہی جادو تھا اب کیا پوچھنا بھیا  
 کے دل پر جسکی تقریر کا ایسا اثر ہوا ساری دنیا پر اپنا جادو پھیلانے لگتا ہے۔

مادھوی۔ چلو چلی کے یہاں چلیں  
 برجن۔ ہاں بلکہ کا تو خیال ہی نہیں۔ دیکھیں کیا کہتی ہیں خوش تو کیا ہوگی۔  
 مادھوی۔ اُنکی تو اچھلاکھا ہی یہ بھتی۔ خوش کیوں نہ ہوگی۔  
 برجن۔ چل۔ ماں یہ خبر سنکر کبھی نہیں خوش ہو سکتی۔

دونوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں۔ دونوں جن کی رانی تھیں۔ برجن کو دیکھ کر  
 اکثر آدمی سر تعظیم خم کرتے تھے۔ لوگ ذرا ادب اُسکے سامنے سے ہٹ جاتے۔

خاص دعا میں اس کی یکساں عزت تھی۔

کوئی مادہ صہی سے پوچھے تیرے پیر اب زمین پر کیوں نہیں پڑتے تیرے  
 نذرانہ ہرے پر کیوں مسترت کی مرغی بھلا کافر ہے۔ تجھے کو کسنی دولت مل گئی۔ تو  
 اب متفکر و مغرور نہیں نظر آتی۔ تجھے اپنے عظیم سے ملنے کی اب کوئی امید نہیں، تجھے پر  
 محبت کی نگاہیں بھی نہیں پڑیں، تیرے کانوں میں محبت کی آوازیں بھی نہیں پہنچیں  
 تو کیوں پھولی نہیں سنا تی، اس کا جواب صہی کیا دے گی، کچھ نہیں، وہ سر جھکا لیگی اور اس  
 کی آنکھیں نیچے جھک جائیں گی، جیسے ڈالیاں پھیلنے کے بوجھ سے جھکنا شروع کر دیں  
 شاید آئندہ کے چند قطرے ٹپک پڑیں مگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلیگا۔

ملو صہی محبت کے نشہ سے متواں ہے، اس کا دل دیوانہ محبت ہے، اس کی محبت  
 بازار کا سودا نہیں، اس کا پریم کسی چیز کا ٹھکانہ نہیں، وہ محبت کے عین محبت نہیں چاہتی  
 اُسے ناز ہے کہ ایسے پاک عشق آدمی کی عزت میرے دل میں جلوہ گزیرے، اور یہی اس کی  
 دیوانگی، اُس کے پریم، اُس کے عشق کا صلہ ہے۔

دوسرے مہینہ میں برج رانی نے بالاجی کے خیر مقدم میں ایک پرنسوز نظم لکھی۔ یہ  
 شاعرانہ معجزہ تھا جب یہ نظم شائع ہوئی تو علمی دنیا باوجود برجن کی رونا فرسوں بلند  
 پروازیوں سے مانوس ہونے کے حیرت میں آگئی وہ طائر فکر و شعری کے آسمان میں گڑھا  
 سے بھی اُڑ گئے نکل جانا، ابکی تارا بکھر چکا، ایک ایک شعر الہامی روشنی سے منور تھا جن لگوں  
 نے وہ نظم پڑھی بالاجی کے ذہنی ہونے کے، شاعر و شعبہ باز ہے جس کی پٹاری میں مجائے  
 ساہنوں کے دل بند ہوتے ہیں؟

## تاریخ کا ایک ورق

ناظرین۔ بالاجی کے قومی کارنامے آپ کو تاریخ کے صفحات میں آپ نے دیکھے ہوئے ملیں گے۔ ہم نے ان صفحات میں ان حالات اور واقعات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جو اس کارنامے کے محرک ہوئے۔ کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا بہت مشکل کام ہے مگر اس کا صلہ بھی ساری دنیا کی دولت سے زیادہ گراہنا اور بیش قدر ہوتا ہے۔ بالاجی کے نام پر آج تاریخ کا قلم جد کھلے لگتا ہے۔ شعراء اس کے نام پر بلند پرانیوں کے موتی نثار کرتے ہیں۔ ملک کے دعو دار اس کا جس کا رہے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہی لوگوں کے سر تعظیم سے جھک جاتے ہیں اور دل قومی جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا آسان کام نہیں مگر اس کا صلہ جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ حیات بخش ہوتا ہے۔ چپچھاں کی گود میں بالاجی کے کارنامے سننے ہیں اس کی یاد دہانی میں حوصلہ اور بانوؤں میں قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے نام سے سبیاں سب رہی ہیں اور درگاہیں کھل رہی ہیں۔ اس کے نام پر ہندوؤں میں فصاحت کے پھول چھلک رہے ہیں۔ امر اپنے مغلوں میں اور غزبان اپنے جھوٹے پڑوں میں اس کے گنا گاتے ہیں۔ اس کی صورت آنکھوں سے نہیں اترتی اس کی پرنور اور پر حوصلہ آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے اس کے خیالات آئینہ الی سنوں کے ماحول کی سنہاں کے اوسیلوں تک اس کے ہم وطنوں کے لئے گہندہ پور کا کام دیں گے۔

دیکھنے ایک دے یا دلد کا شخص قوم کو ابھانے میں کہاں تک کامیاب  
 سکتا ہے اس کام کے راستے میں دولت کی امداد کا صل کی کمی حائل نہیں ہو  
 سکتی۔ روحانی قوت۔ دردمندان۔ وسیع ہمدردیاں۔ یہ ضروری سامان ہیں ابھی  
 بہت نہیں گولے کہ پرتاپ چند ایک گنا آدمی تھا۔ آج اس کا نام بچہ بچہ کی  
 زبان پر ہے۔ کیا اس کے پاس قابیل کا خزانہ تھا! پنگھٹ پر جب عورتیں کو لہولہ  
 گھڑے رکھ پانی کے لئے آتی ہیں۔ تب بالاجی ہی کے چرچے ہوتے ہیں اور انہیں کے  
 جس گائے جلاتے ہیں۔ اناج کے کھیتوں میں انہیں کی بڑائی ہوتی ہے۔ یہی قومی خدمت  
 گنہگار کا نام ہے۔ ملک میں جب وہ گئے پھولوں کی برکھا ہونڈا۔ بنارسل من  
 پھول پیروں تلخو ند ڈلے گئے۔ امدن مندوں میں دیوتاؤں کو پھولوں کی  
 باس نہ ملی۔ رنگین مزاجوں کے گلے میں پھولوں کے گجرے نہ دکھائی دئے اور سینوں  
 کی سچیں پھولوں سے نہ سجائی جاسکیں۔ مگر بالاجی کو اس نمائش اور دھوم دھما  
 سے مطلق دلچسپی نہ ہوئی۔ دوسرے دن جب وہ بھاگے بھتی کے کنارے پانی  
 میں خوب آنا ب کی بہار دیکھ رہے تھے تو کئی عورتیں پانی بھرنے آئیں اور  
 گھڑوں کو پانی میں گھاگھا کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے کہا:- بہن تو نے سنا نہیں۔ بالاجی آئے ہیں۔

دوسری بولی:- ہمسے ایسے بھاگ کہاں چوآن کے درشن ملیں  
 تیسری بولی:- تو چلے پر راضی ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں۔ وہ آج اپنی گاو  
 شالہ پکھنے آئی تھیں کون دوسرے۔ مجھے گھوڑوں کے لئے کھلی اور دانہ بھی لیجا رہے  
 ایک پتھر دو کا ج ہو جائیگا۔

چوتھی بولی :- ایسے دیوتا کے درشن نہ کریں گی تو بڑا پاپ ہوگا۔ دیکھو جب سے ان کا گٹھن لکھ لکھ رہے ہیں تو ان کو دنوں وقت دودھ پینے کو مل جاتا ہے۔ نہیں تو روکھی روٹیوں کو ترستے تھے۔

بالا جی نے یہ باتیں سنیں اور بھائی بھائی کے گلزار پانی کی طرح چہرہ سُرخ ہو گیا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں گٹھن لکھوا دئے تھے۔ انکا سر دھانت تھا کہ ہماری قومی تباہی اور زوال کا اصلی سبب ہمارا جسمانی ضعف اور ذالوں کی بیجا تفریق ہے جب ہم اے بچے روکھی روٹیوں کو ترستے ہیں اور دودھ گھسی کی خوشبو بھی اُنکے ناک تک نہیں پہنچنے پاتی تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کے قوی ایسے ضعیف۔ چہرے ایسے پروردہ اور اعضا ایسے کمزور ہیں۔ بلند ارادے اور اونچے خیالات، چھٹے سینوں اور مضبوط کلائیوں میں رہا کرتے ہیں۔ جب تو اُسے جسمانی کا یہ حال ہے تو خیالات کیسے اونچے اڑیں۔ استقلال کہاں سے آئے جرات کہاں سے پیدا ہو۔ پھل کیسے کھلیں جب جڑ کو غذا نہیں پہنچتی پھل کہاں سے آئیں جب پڑسوکھ جاتا ہے تو میں کو تر کر دو۔ اُس میں پائش ڈال دو۔ پھر دیکھو کہ کیسے خوشنما اور خوشبودار پھل کھلتے ہیں اور کیسے لذیذ اور سلیکھل لگتے ہیں جسمانی ضعف سے زیادہ ہمیشہ ہی دشمن و شرمناک حقائق ہیں جس سے ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے نیچی اور اونچی ذاتیں مقرر کر رکھی ہیں اور نظریات کے اس زبردست قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں کہ خلقت تدریج ترقی کرتی ہوئی اعلیٰ تر مدارج پر پہنچتی ہے۔ آج تک جتنے رشتی اور مہلتا ہو گئے ہیں۔ ان سمجھوں نے آریہ ورت سے اس تفریق کے مٹانے کی کوششیں کی ہیں۔ مہلتا بدھ وہ پہلے ہندو تھے جنہوں نے ہندوؤں کی پیشانی

پر سے اس بے الصفتی اور ظلم کا داغ مٹانا چاہا اور انہیں بہت کچھ کامیابی ہوئی  
 اُنکے بعد سری شکر، سری مانا، سری چیتن، سری رام کرشن، سری سوامی دینا  
 اور سوامی رام تیرتھ بھی مہاتماؤں نے یہی تعلیم دی کہ اپنے بھائیوں کو اپنا بھائی  
 سمجھو۔ جاہل بھائی بھی تمہارا بھائی ہے اور نادار بھائی بھی تمہارا بھائی ہے۔ اسے  
 حقیر مت سمجھو تمہاری نجات اتفاق سے ہوگی تفریق سے نہیں جو شخص اپنے ہوطنوں پر  
 حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے وہ کبھی ترقی کے زمین پر نہیں پہنچ سکتا۔ پیادو! جب تک  
 ایک چمڑے کے سامنے برہمن برتر تعظیم جھکا نا نہ سیکھے گا۔ اس وقت تک کسی نادہرگز  
 نہ پار لگے گی۔ یقیناً باوجود تمہاری نادہرگز سے ایک انگل بھی نہ ٹلے گی۔ تمہارے  
 ڈانڈے لوٹ جائیں گے تمہارے بادبان پھٹ جائیں گے اور تمہارے ملاح  
 ہارپ ہارپ کریدم ہو جائیں گے۔

یہ بالاجی۔ کہے خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ اُنکی زندگی نے فحاشی کی ورنہ وہ  
 ہندوستان کیلئے کیا کچھ نہ کر جاتے۔ تاہم جو کچھ انہوں نے کیا اس پر ہر ایک ہندوستانی  
 فخر کر سکتا ہے۔ امیر انڈیا گاؤں، جہاں بالاجی کا کنوٹشا نہ قائم ہو، ہندوستان  
 کی چپہ چپہ زمینوں کو انہوں نے اپنے قدموں سے روشن کیا۔ پونا، بمبئی، مداس، میسور، کلک  
 گجرات جلیسے۔ دُور دراز جگہوں میں مہینیل ہے اور اپنی ملینا دار سے سوتی ہوئی  
 آتماؤں کو چمکاتے ہے۔ چھ ہفتہ کی کوشش میں انہوں نے صرف میسور میں کم و بیش تین  
 ہزار کنوٹشا لے کھلوادے۔ آفتاب کی چمک سے پانی میں بھی ایسی چمک آجائی ہے۔  
 کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ بالاجی کا جوش اور حوصلہ دوسروں کو سرگرم، پُر جوش اور  
 حوصلہ مند بنا دیتا تھا۔ جہاں جہاں بالاجی لے کنوٹشا لے قائم کئے وہاں خود بخود

اکھڑے بن گئے ہیں ختم کی خوش آئند صدائیں صبح کو مبارکباد دیتی ہیں اور لہکار کی  
پرجوش آوازیں درختوں کو نیند سے جگاتی ہیں۔

ذات کی باہمی گفتگو میں ملنے کیلئے انہوں نے جو نبردِ است کو شمشیں کہیں  
صفوۂ تاریخ کے لئے ہمیشہ باعثِ ناز رہیگی۔ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب انہوں نے اپنے  
"ارجن سبھا" کی بنیاد ڈالی تین سال کا اندازاً ایسا شاید ہی کوئی شہر یا گاؤں تھا جہاں  
"ارجن سبھا" کی شاخیں نہ کھل گئی ہوں۔ یہ انہیں "ارجن سبھاؤں کی کوششوں کا پھل  
ہے کہ آج ہر حصہ میں نئی ذاتوں کیلئے جدوجہد اور سے۔ جدوجہد اور جنگ ہاؤس قائم  
ہیں۔ "ارجن سبھا" کے ممبرانِ مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں اور ان ذاتوں کے تلمذ اور منتظر  
کے عیوب کی اصلاح کرنے میں سرگرم ہیں۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں گھومتے ہیں اور ہندو  
قوم کے مظلوموں کو بیداری کا شعلہ سناٹے ہیں۔ ان سے بھائیوں کی طرح بغلیں کرتے  
ہیں اور انکے دلائل میں خودداری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مبارک اور جاں بخش ہوتا  
تھا وہ نظارہ جب بالاجی اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر انکا دل بو  
حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے تھے۔ آج بالاجی کا نام شکر یہ لوگ پھولے نہیں سماتے  
ان لوگوں میں اخلاق و عادات کے سدھارنے کی جو کوشش آپ دیکھتے ہیں۔ یہ بالاجی  
جی ہی کی جانفشانیوں کا نتیجہ نیک ہے۔

ہمارے قومی کاموں کا ایسا کوئی جزو نہیں ہے جو بالاجی کی عنایت کا ممنون  
نہ ہو۔ انکو وقت، انکا دھیان، انکی سرگرمی اور انکا سب کچھ قوم کی خدمت کے لئے  
دفع تھا۔ وہ قوم کے سرتاج اور قوم کے چاکر دونوں ہی تھے۔



## سنارس میں آمد

جب سے شہرت نے برج رانی کو اپنا منہ طور نظر بنایا تھا اُسکے یہاں ہر دم عورتوں کا جھگڑا لگا رہتا تھا۔ شہر میں مستورات کی کسی سبھائیں تھیں اُنکے متعلق سارا بوجھائی کو اٹھانا پڑتا۔ اُسکے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی اکثر عورتیں اُسکی ملاقات کو آتی رہتی تھیں جو تیرتھ جانتا کر کے اُسے ملنے آتا تھا۔ وہ برج سے ضرور ملاقات کرتا۔ راجہ صرام سنگھ نے اُسکے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا تھا۔ اور اس مجموعہ نے اُسکی شاعرانہ سطوت کا ڈھنگا بجا دیا تھا۔ ہندوستان کا تو کیا شمار نیو پب اور امریکہ کے سربراہ آدرہ شعرا نے بھی اسے اُسکے محاسن کلام پر مبارکباد دی۔ ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی خوش مذاق شخص ہوگا جسکی کتابوں کا طاق اس دیوان سے آراستہ نہ ہو اور برج کے کلام کی قدر کرنے والوں میں بالاجی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنی پُرندرتقریروں اور تحریروں میں اُسی کے کلام کی سندیں پالکتے تھے اور ایک بار سرسوتی میں اُسکی پُرندرتنقید لکھی تھی۔

ایک دن برج صبح کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ سیٹا۔ چند کزور۔ کہنی اور رانی آئیں۔ چند کزور زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔ سیٹا متیں اور خاموش۔ کہنی کا چہرہ پُرشمرہ۔ اوداع شباب کی تصویر اور رانی ناک چوٹی سے درست۔ عطر میں ڈوبی ہوئی۔ چند رانے ان عورتوں کو فرش پر بٹھایا اور اُنکی غلط مدامت کی۔ برج

نے صبح کا وقت فکر سخن کرنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس وقت وہ بلا کسی ضرورت کے سکیموں، سہیلیوں سے نہ ملحق جلتی تھی۔ باغیچہ میں ایک خوبصورت کُچ تھا۔ گلاب کی خوشبو سے بسی مٹی مہرائیں اُٹتی تھیں۔ وہیں برجی ایک قالین پر بیٹھی ہوئی فکر سخن کیا کرتی تھی اور بحرِ معنی سے جو موتی وہ نکالتی اسے مادیوی سداکِ قلم میں پرو دیا کرتی آج بہت دنوں کے بعد اہل شہر کے متواتر تعاضلوں پر برج نے بالاجی کو بنارس میں اس کی دعوت دینے کے لئے قلم اٹھایا تھا۔ بنارس ہی وہ شہر تھا جس کی یاد کبھی بھی بالاجی کو بے چین کر دیا کرتی تھی مگر باوجود اہل بنارس کے مسلسل دعوت اور اصرار کے انہیں بنارس آنے کی کبھی فرصت نہ ملی بیسٹون اور نگون تک گئے مگر بنارس کی طرف رُخ نہ کیا۔ اس شہر کو امتحانِ کدہ سمجھا کرتے تھے۔ اسی لئے آج برج انہیں بنارس آنے کی دعوت دے رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دعوت انہیں ضرور کھینچ لائیگی۔ جب کوئی تانہ خیال آجاتا ہے تو برج کا چاند سا چہرہ جھپک اٹھتا ہے اور مادھوی کے چہرہ پر سرخی کی جھلک آجاتی ہے۔ باغیچہ میں گلاب کے بہت پھول کھلے ہیں۔ رات کی شب بزم میں کچھ کر وہ اس وقت بہت سہلے معلوم ہوتے ہیں مگر اس وقت جو تانگی اور سہانا پن ان دونوں پھولوں پر ہے اُسے دیکھ دیکھ کر دوسرے پھول ٹرٹے جاتے ہیں۔ دونوں پھول باغِ فردوس کے پھول ہیں۔

مگر نہیں۔ ہم جھگرتے ہیں۔ ایسے حُسنِ فلاوینز کو پھول سے کیا نسبت پھول میں ڈھلاؤ دیری کہاں۔ دُور کہاں۔ کشش کہاں کسی نے ایسا پھول دیکھا ہے جسے دیکھنے سے کبھی آنکھیں آسودہ نہ ہوں اور دیکھنے کی ہوس باقی نہ رہے۔ ایسا پھول کہاں ہے جسے دیکھ کر دل پر ایک بجلی سی کو نہ جلے جسکی صورت دل پر نقش ہو جائے

شعر لے پھول کا رتبہ بڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا اس حسن کو چاند سے تشبیہ نہ دی کہ وہ یہاں  
 بھی شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چاند میں ڈول فری کہاں۔ چاند میں روشنی ہے۔  
 چمک ہے مگر حسن کہاں۔ کیا چاند بھی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے سے ہی نہ بھرے کیا چاند  
 بھی جگر کو مسنے لگتا ہے۔ کیا چاند کو دیکھ کر بھی رُوح پر ایک نشہ سا ہوتا ہے۔  
 حق یہ ہے کہ حسن کی تشبیہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں دیا جاسکتی۔ کسی چیز میں یہ کشش  
 یہ اثر۔ یہ فلا دہری نہیں۔

دوست بچتے بچتے برجن کرہ میں آئی۔ سیوٹی بولی: "آج بڑی دیر لگائی ہے۔"  
 برجن۔ "گنتی نے سورج کے بلانے کے لئے کتنی تپیل کی تھی۔"

سیتا۔ بالاجی بڑے ٹھہر ہیں۔ میں تو ایسے آدمی سے کبھی نہ بولوں۔  
 رگنتی۔ جن نے سنیا اس لئے اُسے گھر بار سے کیا ناٹ۔

چند رکنور۔ یہاں آئیگے تو میں بہن پر کہہ دوں گی کہ حضرت یہ معشوقانہ انکار کہاں سے کیا ہے؟  
 رگنتی۔ جہاں رانی رنی مہاتماؤں کا تواذب کیا کرو۔ نیاں کیلے کرتی ہے؟

چند رکنور۔ اہ وہیں کہہ سب کر دیں گی۔ سب جگہ جلتے ہیں یہیں آتے پر تھکتے ہیں۔

برجن (مسکرائیں) اب بہت جلد ریش پاؤں گی مجھے یقین ہے کہ اس مہینہ میں وضرور آئیگے  
 سیتا۔ دھنیہ بھاگ کہ دوش تو میں گئے۔ میں تو جب تک حال پڑھتی ہوں تو یہی جی  
 چاہتا ہے کہ پاجا فک تو سر بکھر کر گھنٹوں روں۔

رگنتی۔ ایسٹور نے ان کے ہاتھوں میں بٹا جس دیلے۔ دارانگر کی رانی صاحبہ  
 مری چکی تھی۔ یقین مانو دم ٹوٹ رہا تھا۔ کہ بالاجی کو خبر ہوئی۔ فوسا پیچھے  
 اڈم کی دم میں اٹھا کر بٹھا دیا۔ ہمارے منشی جی (شوہر) ان دنوں وہیں تھے۔

کہتے تھے کہ رانی جانے خزانہ کی کُنجی لیکر بالاجی کے پیروں پر کھدی اور کہا آپ اس کے مالک ہیں۔ بالاجی نے خزانہ کی کُنجی نہ لیکر کہا: مجھے خزانہ درکار نہیں آپ اپنی ریاست میں تین سو کوڑو مسئلے کھلوا دیجئے۔ زبان سے نکلے گی دیر میں آج دانا نگر میں دودھ کی ندی بہتی ہے۔ ایسا مہاتا کون ہوگا۔  
چند روز گزرے۔ راجہ نے لکھا کہ تپ دق انہیں کی ٹوٹیوں سے چھوٹا۔ سارے حکیم ڈاکٹر جماب دے چکے تھے جب بالاجی چلنے لگے تو مہاتانی صاحبہ نے نولاکھ کامونیوں کا ہار ان کے پیروں پر کھدیا۔ مگر اُسکی طرف دیکھا تک نہیں۔

رانی۔ عجیب مُردہ طبیعت کے ہیں۔  
رکمنی۔ ہاں اور کیا۔! نہیں چاہیے تھا کہ ہمارے لیتے بلکہ گلے میں ڈال لیتے برجن نہیں لکھ سہانی کو پہنا دیتے۔ کیوں سکھی؟  
رانی۔ ہاں میں اُس ہار کے لئے غلامی لکھ دیتی۔  
چند روز گزرے ہمارے یہاں تو ارجن بھلے کے ممبر بن بیٹھے ہیں۔ ڈھائی سو روپے لاکھ جتن کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ اسے اٹھا لیتے کہ گھوڑا لیں گے۔ کیا ارجن ہاں بلا لگھوڑے کے نہیں چلتے۔

رانی۔ کل یہ لوگ قطار باندھ کر میرے مکان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا  
اسی اثنا میں سیپوتی تازہ اخبار ملئی۔

برجن۔ کوئی نئی خبر ہے؟  
سیپوتی۔ ہاں بالاجی مائیکوورا نے ہیں۔ ایک ہیر نے اپنی لڑکی کی مشادی کا نوید بھیجا

تھا اس پرالہ! بلکہ سے ارجن سمجھا کے لمبوں کے ساتھ راتوں رات مانگیور پہنچے۔  
 امیوں نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا۔ اور ملکہ باخسو گائیں، انہیں بھینٹ دی  
 ہیں۔ ہلالجی نے دلہن کو دعا دی اور دولہا کو گلے لگایا۔ پانچ امیر ارجن سمجھا کے  
 ممبر بنائے گئے۔

ارجن۔ نہایت دلچسپ خبر ہے۔ مادھوی اسے کاٹ کر رکھ لینا۔ اور کچھ؛  
 سیوتی پٹنے کے باسیوں نے ایک ٹھاکر دوارہ بنوایا ہے۔ پٹنے کی ارجن سمجھانے پر  
 دھوم دھام سے اس کا جلسہ کیا۔

ارجن۔ پٹنے کے لوگ خوب سرگرمی سے کام کر رہے ہیں  
 چند کنور۔ کیا سوچیں بھی اب سیندر پہنیں گی۔ باسی ٹھاکر دوارے بنوائینگے  
 رکتی۔ کیوں وہ آدمی نہیں ہیں۔ ایشور نے انہیں نہیں بنایا۔ آپ ہی اپنے مالک  
 کی پوجا کرنا جانتی ہیں۔

چند کنور۔ چلو ہٹو باسیوں سے مجھے ملائی ہو۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔  
 رکتی۔ ہاں تمہارا رنگ ذرا صاف ہے مگر اور کتنے کپڑے سے ٹیس ہو۔ بس اتنا  
 ہی فرق ہے کہ اور کچھ

چند کنور۔ اتنا ہی فرق کیوں ہے۔ زمین کو آسمان سے ملائی ہو میں کچھ اہموں کے  
 خاندان میں ہوں معلوم ہے۔!

رکتی۔ ہاں معلوم ہے اور نہیں معلوم تھا تو اب معلوم ہو گیا۔ ٹھاکر صاحب کئی باسی  
 سے بد بک کر کشی لڑ بیگے، یا سر پر ٹیڑھی پکیا ہی رکھنا جانتے ہیں۔ میں تو  
 جانتی ہوں کہ کوئی معمولی باسی بھی انہیں بغل میں دبا لیگا۔

چند کنویر منہ میں زبان ہے جو چاہے کہہ لو ہمارے باوا جے پور میں صوبہ دار  
تھے ہملوگوں کی سیرتاؤں میں مشہور ہے۔

برجن۔ اچھا اب اس قضیہ کو جملے دو۔ تم دونوں جب آتی ہو لڑتی ہی آتی ہو۔  
ایک مہینہ گزرنا۔ برجن کی تازہ نظم خیر مقدم کا پیغام لیکر بالاجی کے پاس پہنچی  
مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ انہیں نے دعوت قبول کی یا نہیں۔ اہل بنارس راہ دیکھتے دیکھتے  
تھک گئے۔ بالاجی روز بروز دکھن کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ آخر لوگوں کو بالاجی کی  
ہر گئی اور سب سے زیادہ بالاجی برجن کو ہونی۔

ایک روز جب کسی کو نشان و گمان بھی نہ تھا کہ بالاجی بنارس آئینگے پرانے  
نے آکر کہا۔ ”بہن لو خوش ہو جاؤ۔ آج بالاجی تشریف لائے ہیں۔“  
برجن کچھ کھل رہی تھی۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ مادھوی اٹھ کر دندازہ کی طرف  
اُسی پرانے ناٹھ لے مسکرا کر کہا ابھی آتھو رے ہی گئے کہ یوں بے صبر ہوتی جاتی ہو  
مادھوی۔ کب آئینگے؟ ادھر ہی سے ہو کر جائینگے نا؟

پرانے ناٹھ یہی تو نہیں معلوم کرہے آئینگے۔ انہیں جلوس اور دھوم دھماکا  
سخت نفرت ہے۔ اسی لئے پہلے سے آئے کی تاریخ نہیں مقرر کی۔ راجہ  
صاحب کے پاس آج صبح کو ایک آدمی نے آکر خبر دی کہ بالاجی آ رہے ہیں اور کہا  
ہلکے میرے استقبال کے لئے دھوم دھماکا نہ ہو۔ مگر یہاں بنارس کے لوگ  
اسے کب مانتے ہیں۔ استقبال ہوگا اور دھوم دھماکا کیسا جلوس نکلیگا اور ایسا  
شانداز کہ ستر کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل۔ چاروں طرف آدمی پھیلے ہوئے  
ہیں کہ جوں ہی انہیں آتے دیکھیں ہر ایک محلے میں ٹیلیفون سے خبر پہنچا دی جائے

کالج اور اسکول کے طلباء در دیاں پہنے بہر کس لئے اشارہ کے منتظر ہیں۔ گھر گھر پھول برس لئے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بازار میں دکانیں سجائی جا رہی ہیں شہر میں ایک پھول سی مچی ہوئی ہے۔

مادھوی۔ ادھر سے جاسینگے تو ہم انہیں روک لیں گے۔  
پران ناٹھ۔ ہم نے کوئی تماشائی تو کی ہی نہیں۔ روک کیا لیتے گے۔ اور یہ بھی تو نہیں معلوم کہ کدھر سے جاسینگے۔ مادھا چرن نے دھوکا دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں امرتسر کی طرف سے اُن کے آئے تک لوٹ آؤں گا اور اسی تک انکا کہیں پتہ نہیں۔ خیر۔

برجین دسو چکے۔ اسنی امار لئے کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا۔  
پران ناٹھ۔ ہاں اب کیا اتنا مجھی نہ ہوگا میں باہر فرش دینے کچھوٹا ہوں  
پران ناٹھ باہر تیار یوں ہیں مصروف تھے۔ مادھوی پھول چُٹنے لگی۔ برجین نے دوسرا تھمال دھودھا کر صاف کیا۔ سیدتی اوچند رائد سب چیزیں قرینہ سے دیکھنے لگیں۔

مادھوی خوشی کے ماتھے پھولی نہ سمجھتی تھی۔ بار بار چوکا کر روزہ کی نظر دیکھتی کہ کہیں وہ آتے نہیں گئے۔ بار بار کان لگا کر سنتی کہ کہیں باپ چکے آوازیں تو نہیں آ رہی ہیں۔ دل ماتے تیشی کے دھڑکے ہاتھا۔ پھول چُٹتی تھی مگر دھیان دوسری طرف تھا۔ ہاتھوں میں کتنے ہی کانٹے چُٹھائے پھول کے ساتھ کئی ٹیرول کی شاخیں مردوڈ الیں کبھی دفعہ شاخوں میں الجھ کر گری۔ کئی دفعہ ساڑی کانٹوں میں پھنسا لی اسوقت اسکی حالت بالکل بچپن کی سی تھی۔

مگر برجن کا چہرہ بالکل اداس تھا۔ جیسے بھرا ہوا پیالہ ذرا سا ہلنے سے بھی چھلک پڑتا ہے۔ اسی طرح بچوں پرانی باتیں یاد آتی تھیں اُسی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ آہ کبھی وہ دن تھے کہ ہم اور وہ بھائی بہن تھے، ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ رہتے تھے یا آج سولہ سال گزر گئے، انکی صدفت دیکھنی بھی لفیٹ ہوتی، تب میں ذرا بھی روتی تو وہ میرے آنسو پونچھتے اور میرا دل بہلاتے۔ اب انہیں کیا خبر کہ یہ آنکھیں کتنا روتی ہیں اور اس دل نے کیسے کیسے صدمے اٹھائے ہیں کیا خبر تھی کہ ہماری قسمتیں ایسے گل کھلائی گئی، ایک بیوگن ہو جائیگی اور دوسرا سنیاسی۔  
 ایک ایک ملاحوی کی خیال آیا کہ سنا ما کو شاید بالاجی کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔  
 برجن کے پاس آکر بلی "بہن ذرا میں چچی کے یہاں جاتی ہوں۔ نہ جانے کسی نے ان سے کہا یا نہیں۔

پران ناخدا باہر سے آ رہے تھے۔ یہ سنکر بولے۔ وہاں سویرے ہی میرے پہلے خبر ہو گئی، خوب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بالاجی بھی سیدھے گھر کی ہی طرف جا بیٹھیں گے۔ ادھر سے آئے ہیں۔  
 برجن۔ تو ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔  
 مادھوی۔ آتی کا تعال لاؤ۔

برجن۔ کین لے چلیگا۔ مہری کو بلالو (چونک کر)۔ ارے یہ ترے ہاتھوں میں خوں کہاں سے آیا؟

مادھوی۔ اُپہنہ۔ پھول جلتی تھی۔ کانٹے لگ گئے ہونگے۔  
 چندرا۔ ابھی تھی ساڑی آئی ہے آج ہی پھاڑ کے رکھ دی۔  
 مادھوی۔ تمہاری بلا سے۔



مادھوی نے یہ کہہ کر تیار ہو کر آگئیں۔ پر آب ہو گئیں۔ چند راتوں بہت نیک عورت تھی مگر جسے بابو رادھا چرن نے قومی خدمت کے لئے نوکری سے استعفا دیا وہ بالا جی کے نام سے چڑھتی تھی۔ برجن سے تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی مادھوی کو چھپڑتی ہوتی تھی۔ برجن نے چند رات کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”جہاں صندوق سے دوسری سائی نکل لو اسے رکھاؤ۔ رام رام بار کے ہاتھ چھلنی کر ڈالو۔“

مادھوی دیر ہو جائیگی۔ میں یہیں ہی چلوں گی۔

برجن۔ نہیں ابھی گھنٹہ بھر سے زیادہ ہبلت ہے۔

یہ کہہ کر برجن نے پیار سے مادھوی کا ہاتھ دھویا۔ اس کے بال گوندھے۔ ایک نچے لبتی ساری پہنائی، جہاں سارے عافی، او اسے گلے سے لگا کر پر آب آگئیں۔ سائی سے تانکتی ہوئی بولی۔ بہن۔ دیکھو دھیرج ہاتھ سے نہ جلتے۔

مادھوی مسکراتے ہوئے بولی ”تم میرے ہی ساتھ رہنا۔ مجھے سنبھالتی رہنا۔ مجھے اپنی نچل پر آج بھر دوسرے نہیں ہے۔“

برجن سمجھ گئی کہ آج پریم نے مدہوشی کا درجہ اختیار کیا ہے اور شاید ہی اس کی انتہا ہے۔ آہ! یہ باولی بالوں کی دیوار کھڑی کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں مادھوی۔ برجن بیلوٹی۔ چند اگلی عورتوں کے ساتھ سباما کے گھر کر چلیں۔ وہاں کی تیاریاں دیکھیں تو دنگ رہ گئیں۔ دروازہ پر ایک ہنایت وسیع تنگ کھڑ تھا۔ فرش خوش اور شیشہ والے آستانہ۔ نو بہت چھڑ رہی تھی بڑے بڑے نوکروں میں مہرے اور کھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شہر کے بوسلے نامدار خوش وضع لباس پہنے ہوئے استقبال کرنے کو کھڑے تھے۔ فرش اوگائیاں ایک بھی نظر نہ آئی تھیں کیونکہ

بالاجی ہمیشہ سبیل ہی چلا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ گلے میں جھولیاں ڈالے ہوئے دکھائی دیتے تھے جن میں شاید بالاجی پر نشانہ کرنے کے لئے نلے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ راجہ دھرم سنگھ کے پانچوں لڑکے رنگین کپڑے پہنے زعفرانی صافے باندھے۔ ریشمی جھنڈیاں بکریں کھولے بگل بجا رہے تھے۔ جوں ہی لوگوں کی نظر بدھن پڑی ہزاروں سرفرا ادب خم ہو گئے۔ جب خاتونیں اندر گئیں تو وہاں بھی آئینے اور سامان اور کمرے دلہن کی طرح سجے ہوئے پائے۔ صدف ہاتھ میں مہارکباد کے گلے لگانے کیلئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھولوں کے ڈھیر جابجا پیسے ہوئے تھے۔ سبلا ایک سفید ساڑھی پہنے صبر و حلم کی تصویر بنی ہوئی دودھ انے پر کھڑی تھی۔ بجرن اومادھوی کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہو گئی۔ بجرن بولی۔ ”اچھی آج اس گھر کے بھاگ بھاگ سے سبلا لے کر کرنا۔ تمہاری بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ ایسٹور تمہیں اس کا بچل دے۔“

عم نصیب ماں کے تر دل سے یہ غانگلی۔ ایک عزم نصیب ماں کی بددعا نے راجہ دشرتھ کو بیٹے کے فراق میں شربت مرگ چکھا یا تھا۔ کیا سبلا کی یہ خالے اثر ہو سکتا ہے؟

دو لڑکیں ابھی اسی طرح کی باتیں کر رہی تھیں کہ گھنٹے اوٹا قوسوں کی صدا اٹھنے لگی۔ لکھن شہر چاک بالاجی آ پہنچے۔ عورتوں نے مہارکباد کا ناشروع کیا۔ مادھوی نے آتی کا تھال لے لیا اور راستہ کی طرف ٹھٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ذرا دیر میں ڈی پرش تو جواں لڑکی ایک جماعت نظر آئی۔ اُسکے بعد بجرن سبلا کے ایک سو بچپس ممبر گھوڑوں پر سوار کھلتی دئے۔ اُنکے پیچھے بیسٹار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ مسافر شہر بھٹ پڑا تھا شانے سے شانے چھل رہے تھے۔ سمندر کی ایک لہر تھی کہ بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس ہجوم میں بالاجی کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے بادل میں سے چاند نکلا ہو۔ پیشانی پر سرخ چندن کا

تک تھا اندر گدن میں گیرے رنگ کی ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔  
 سبامہ دروازہ پر کھڑی تھی جوں ہی بالاجی کا چہرہ اُسے نظر آیا ضبط ہاتھ  
 جاتا رہا۔ دروازہ سے ہاتھ نکل پڑی اور سر جھکائے آنکھوں سے موتی برقی بالاجی  
 کی طرف چلی۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا پہاڑ لگائے لگائے کیلئے  
 بیقرار ہو رہی ہے۔

سبامہ کو اس طرح آتے دیکھ کر سب لوگ روک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان  
 سے کوئی دیوی اتر آئی ہے۔ جو طرہ سناتا چھا گیا۔ بالاجی نے کئی قدم آگے بڑھ کر کہا  
 کہ برنامہ کیا اور اُسکے پیروں پر گر پڑے۔ سبامہ نے انکا سر انہی کود میں لے لیا  
 اور اُنکے ماتھے پر کئی بوتل سے دئے، آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا پہاڑ لگائے  
 اُس پر آنکھوں سے موتی برس رہی ہے۔

اس روح افزا نظارہ کو دیکھ کر لوگوں کے دل قومیت کے نشہ سے مدہوش  
 ہو گئے۔ پچاس ہزار لوگوں سے آواز آئی، ”ہالاجی کی جے“ بادل گر جا اور چاروں طرف سے  
 بھولوئی برکھا ہونے لگی۔ پھر اُسی طرح گھن گھر گھر صد بلند ہوئی ”مستی سالگرم  
 کی جے“۔ اُسے اُسے آدمی حب وطن کے نشہ سے مست ہو کر دوڑے اُسبامہ  
 کے قدموں کی خاک پیشانی پر ملنے لگے۔ ان نعروں سے سبامہ ایسی خوش ہو رہی تھی  
 جیسے مہر کے سننے سے ناگن متوالی ہو جاتی ہے۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال  
 پایا پہاڑ لگائے۔ اس لیے بہار بن گئے ملنے سے ڈرائی ہو گئی ہے اُسی تن کی بدولت آج اُسکے  
 قدموں کی خاک لوگوں کی آنکھوں کا مہر ہے اور ماتھے کا چند بن رہی ہے۔  
 عجیب حیات بخش نظارہ تھا یا بار جے جے کار کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اُو عالم بالہ کے بنے والوں کو بھارت کی بیداری کا مرضہ سُنا تے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کو  
 کلیمے سے لگائے ہوئے ہے۔ بہت سن کے بعد آج اس نے اپنا کھوپا جو اللہ پایا  
 ہے وہ لال چٹا سکی جیم بھری کماٹی تھی۔ پھول چاروں طرف سے نثار ہو رہے ہیں۔ زرد  
 جہاں کی بارش ہو رہی ہے۔ ماں اُو بیٹیا کتر تک پھولوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے  
 ہیں۔ ایسا پُراثر سین کس کی آنکھوں نے دیکھا ہوگا !

سُبا بالاجی کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر کی طرف چلی۔ دو اونہ پر پہنچتے ہی عورتیں  
 مبارکباد گلے لگیں اُو مادھوی سہنرے محال میں موصوف۔ دیپ پھولوں سے آتی  
 اتارنے لگی۔ برجھنے پھولوں کی مالا اُنکے گلے میں ڈالی۔ اُو بالاجی مادھوی نے اپنے چوٹ  
 سے لگا تھا۔ بالاجی نے چمچم برآب سے برجھ کی طرف دیکھ کر یہ نام کیا۔

مادھوی کہی بالاجی کے دشمن کی کتنی آندھوی۔ مگر اس وقت اُسکی آنکھیں نہیں  
 کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ بالاجی کی طرف نہیں تاک سکتی۔ اُسے خوف ہے۔ کہ میری آنکھیں  
 دل کا بھی کھول دیں گی۔ اُنہیں پریم برس بھلا تھا ہے۔ آج پہلی بار مادھوی کے دلیں نئی  
 آندھویں پیدا ہوئی ہیں۔ اب تک اُسکی سب سے بڑی آندھوی تھی کہ بالاجی کے دشمن پاؤں  
 مگر آج آندھوں نے سوا بھارا ہے۔ پوری ہونے کے لئے نہیں۔ آج باغِ حسرت میں  
 ایک نئی کلی لگی ہے۔ کھلنے کے لئے نہیں بلکہ مڑ جانے کے لئے اور مڑ جاکر خاک میں  
 مل جانے کے لئے۔ مادھوی کو کون سمجھائے کہ تو ان آندھوں کو دلیں پیدا ہونے دے۔  
 یہ آندھویں تجھے بہت رُلا لیں گی۔ تیری محبت خلیلی ہے۔ تو اُسکے مزے سے واقف ہے۔  
 کیا اب واقعی محبت کا مزہ لیا جا سکتا ہے

## پریم کا سپنا

انسان کا دل آرزوؤں کا کاشانہ ہے، اور حسرتوں کی بستی۔ کوئی زمانہ وہ تھا کہ  
 مادیوں مال کی گود میں کھیلتی تھی۔ اسوقت دل آرزوؤں اور حسرتوں سے خالی تھا۔ مگر  
 جب مٹی کے گھروں سے بننے لگی۔ اسوقت دلیں یہ آئندہ پیدا ہونی لگیں اپنی گڑیا کا  
 بیہ کرول۔ سب لڑکیاں اپنی گڑیا بیاہ رہی ہیں۔ کیا میری گڑیا کناری رہ سکی ہیں  
 اپنی گڑیا کو کہنے بنواؤ گی۔ اسکا بیاہ رہاؤ گی۔ اس آرزو نے مجھے ہینٹیں لالیا۔ مگر  
 گڑیا کی قسمت میں بیاہ نہ بدلتا تھا۔ ایک روز بادل گھر آئے اور برسلا دھار پانی برسنا۔  
 گھر وندا مینہ میں بہہ گیا۔ اور گڑیا کے بیاہ کی حسرت رہ گئی۔

کچھ دن اور گزرے۔ مال کے ساتھ برجن کے یہاں آنے والی اسکی ٹھہری  
 باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ اسکے بھال میں کھائی اور اسکی گود میں سوتی۔ اسوقت بھی اس  
 کے دلیں ایک آرزو تھی کہ میرا خوب اچھا گھر ہوتا، ہمیں چاندی کے کدے لگے ہوتے۔  
 زمین ایسی صاف ہوتی کہ کھٹی بیٹھے اور پھسل جاتے۔ میں برجن کہا اپنے گھر لہاتی  
 دہاں اچھی اچھی چیزیں بناتی اور بھلاتی اور اچھے سے پلنگ پر سلاتی۔ اور اسکی خوب  
 سیوا کرتی۔ یہ آرزو برسوں تک دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ مگر اسی گھر وند سکون  
 طم ح یہ گھر بھی ڈھس گیا۔ اور آرزوئیں مبدل بہ حسرت ہو گئیں  
 کچھ دن اور گزرے۔ بہار کے دن آئے۔ برجن نے اسکے دل پر پرتا پ چند

کی تصویر کھینچنی شروع کی۔ ان دنوں اس ذکر کے سوا کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ آخر پرتاپ  
چند کی چیری بننے کی آرزو دل میں پیدا ہوئی۔ لیٹے لیٹے دل سے باتیں کیا کرتی۔ راتوں  
کو جاگ جاگ کر سن کی مٹھائی کھاتی۔ ان خیالوں سے دل پر ایک نشہ سا ہوا تا کہ  
پرتاپ چند اسی اثنا میں لاہر ہو گئے۔ اور اسی مٹی کے گھروندے کی طرح یہ ہوائی  
قلعہ بھی ڈھس گئے۔ آرزوؤں کی جگہ دل میں حسرتیں رہ گئیں۔

اب حسرتوں کے مجھوم سے دل میں آندھنوں کی جگہ باقی نہ رہی۔ یہ ناول  
کی اُپاسنا کرنے لگی، برت نہ کھنے لگی تاکہ پرتاپ چند پرندہ مانہ کی مٹی نگاہ نہ پڑے  
اس طرح ایک مدت تک اُس نے تپسورنی کی زندگی بسر کی خیالِ محبت کے نشہ میں  
خود بستی۔ مگر آج تپسورنی کا برت ٹوٹ گیا اور میں نے آندھنوں نے سر اٹھایا اس  
سفل کی تپسیا ایک لمحہ میں بھنگ ہو گئی۔ کیا یہ آندھنیں بھی اسی مٹی کے گھروندے  
کی طرح پامال ہو جائیں گی؟

آج جب مادھوی نے بالاجی کی اتنی اتاری ہے اس کے آسٹو نہیں بھرتے  
سا رادان گزر گیا اور اب ایک کر کے مکے سے نکلنے لگے۔ سوچ تھک کر چھپ گئے  
اور چڑیاں تھک کر گوندوں میں آ بیٹھیں۔ مگر مادھوی کی آنکھیں نہیں تھکیں وہ  
سوختی کر رہے! کیا میں اسی طرح بولنے کے لئے بنائی گئی ہوں میں بھی تپسی  
بھی تھی کہ جس کے لئے اتنا روتی ہوں۔ آد۔ رات بولنے آدھی عمر گزر گئی۔ کیا یہ  
باقی حق بھی بدل ہی کیوں گے۔ کیا میری زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہ آئیگا جسے یاد  
کر کے تسکین ہو کہ میں نے کبھی بھی اچھے دن دیکھے تھے۔ آج بھر پہلے مادھوی کبھی  
ایسی ماس نہ آدہ شکستہ خاطر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی خیالی محبت میں محمد تھی آج

اسکے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ ادر یہ آسنا نہیں کے کرشمے  
میں بھول سولہ برسوں تک حشر توں کی آراہنگا وہ چکا ہو وہی اس وقت  
مادھوی کے خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہے۔

سُہاما کے دل میں بھی آج نئی آندوؤں نے سراٹھار اٹھا جب  
تک بالاجی کو نہ دیکھا تھا سبکے بری خواہش یہ تھی کہ ایک نظر دیکھ کر کلچر  
کر لیتی۔ آج جب ایک نظر دیکھ لیا تو کچھ اور دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی مگر افسوس! مادھوی  
کے گھروٹے کی طرح خاک میں مل جانے کے لئے۔

آج سُہاما - مرجن اور بالاجی میں شام تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالاجی نے اپنے  
تجربات بیان کئے۔ سُہام نے اپنی راحم کہانی سنائی اور مرجن نے کہا تھا راسنا  
بہت ہنسی سمجھون لال کے سنباس کی خبر یاد دہائی۔ جب چمراغ جلنے کا  
وقت آ پہنچا تو بالاجی گنگا کی طرف سندھیا کرنے چلے گئے اور سُہاما کھانا پکانے  
بیٹھی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہن لگا کر کھانا پکا رہی ہے۔  
دنوں باتیں کر لے لگیں:-

سُہاما - میری بی بی لالسا تھی کہ میرا لڑکا دنیا میں نہیں م ہمارا ایشور نے میری لالسا  
پوری کر دی۔ پرتاپ نے باپ کا افسانہ لان کا نام روشن کر دیا۔ آج جب  
سویرے میرے پتی کی بے مٹائی جا رہی تھی تو میرا دل اٹھ اٹھاتا تھا میں  
صوف اٹا چاہتی تھی کہ وہ یہ ویراگ تیاگ دیں۔ دلش کا اٹھار کر نے سے  
میں انہیں نہیں روکتی۔ میں نے تو دیوی جی سے ہی بردان مانگا تھا مگر  
انہیں سنباس میں دیکھ کر میرا کلیجہ بیٹھ جاتا ہے۔

برجن سُباما کا مطلب سمجھ گئی۔ بولی۔ پیچیدہ بات تو میرے دل میں پہلے ہی سے جی  
ہوتی تھی۔ موقع پاتے ہی ضرور ذکر کروں گی

سُباما۔ موقع شاید ہی ملے۔ انکا کون کھانا۔ اس وقت جی میں آوے کہیں چل دیں  
سنی ہوں سوٹا ہاتھ میں لئے اکیلے جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مجھ سے  
اب بیچاری مادھوی کی دشمنیں دیکھی جاتی۔ اسے دیکھتی ہوں تو جیسے کوئی  
میرے پیچھے کیچنے لگتا ہے۔ میں نے بہت عورتیں دیکھیں اور بہتوں کا حال  
کتابوں میں پڑھا مگر ایسا پریم کہیں نہیں دیکھا۔ بیچاری نے آدھی عمر دو  
کر کاٹ دی اور کبھی منہ سے شکارت کا ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں نے کبھی  
روتے نہیں دیکھا مگر روتے والی آنکھیں اور منہ والے ہنہ چھپے نہیں رہتے۔  
مجھے ایسی ہی بھونک لالسا تھی۔ وہ بھی ایشور نے پکڑی کر دی۔ تم سے سچ کہتی ہوں  
میں اسے اپنی بھونک بھتی ہوئی آج سے نہیں بھول سکتی۔

برج رانی۔ آج اسے دن بھر روئے گزرا۔ بہت اُفاس دکھائی دیتی ہے۔  
سُباما۔ تو آج ہی اُس کا ذکر چھڑو۔ ایسا ہنر کل کسی طرف کی ماہ لیں تو پھر ایک  
جگہ تک انتظار کرنا پڑے۔

برج رانی (غصہ کر کے) ذکر کرنے کو تو میں کر ڈول مگر مادھوی خود جیسی خبیثی سے یکساں  
کر سکتی ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

سُباما۔ وہ بیچاری اپنی زبان سے کیا کہیگی ؟  
برج رانی۔ اُسکی آنکھیں آپ ساری رات کھائی کھائی  
سُباما۔ وہ اپنے دل میں کیا کہیگی۔



برجِ رانی - کہتے کیا؟ یہ تمہاری بھول ہے کہ تم مادھوی کو ذرا سمجھ رہی ہو۔ مدت گزری کہ وہ برتاپ چند کی دہن بن چکی ہے ایٹور کے یہاں اُسکا بیاہ اُن سے ہو چکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا دُنیا آدمیوں سے خالی تھی۔ مادھوی جیسی خدمت کو کونسا کھولیں نہ بٹھا کر گا۔ کیا اُس نے اپنی آدمی جوانی مُقت میں رو بہ کر سوائی ہے؟ اُس نے آج تک خیال میں بھی کسی غیر شخص کو جگہ نہیں دی تیارہ برصِ بھارت تیسری کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ پلنگ پر نہیں سوتی۔ کوئی رنگین کپڑا نہیں پہنا۔ بال تک نہیں گوندھائے۔ کیا یہ سب باتیں نہیں کہتیں کہ مادھوی کا بیاہ اُن سے ہو چکا۔ دلوں کا ملاپ سچا بیاہ ہے۔ سینور کا ٹیکہ اور گھٹنہ بڑھن، اور بھالہ بیل یہ سب دُنیا کے ڈھکے سلسلے ہیں۔

سُباما - اچھا جیسا مانا سب سمجھ کر۔ میں صرف جگہ نیسانی سے ڈرتی ہوں۔ راستے کے زینچ گئے تھے، آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ مادھوی ہانچے میں ایکلی بیٹھی ہوئی ناول دیکھتی تھی، او دل میں سوچتی تھی کہ یہ دیکھنے میں کیسے چمکیے ہیں مگر کتنی دُور۔ کوئی وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا میری امیدیں بھی انہیں تاروں کی طرح ہیں۔ اتنے میں برج میں لے اُسکا ہاتھ پکڑ کر بلایا۔ مادھوی چونک پڑی۔

برج میں - اندھیرے میں بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہے؟

مادھوی - کچھ نہیں۔ تاروں کو دیکھ رہی ہوں، ویسے خوشنما ہیں۔ مُرمل نہیں سکتے۔ برج کے کلیجے میں بھی سی لگ گئی۔ ضبط کر کے بولی۔ "تارے گننے کا یہ وقت نہیں ہے جس اہان کے لئے آج سویرے تک پھولی نہیں سماتی تھی۔ کیا اسی طرح اسکی ہمانداری کرو گی؟

مادھوی میں ایسے مہمان کی مہمانداری کرنے کے قابل کب ہوں؟  
 برجن اچھا یہاں سے اٹھو تو میں مہمانداری کرنے کا ڈھنگ بتاؤں گی؟  
 یہ کہہ کر برجن نے مادھوی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ دونوں اند آئیں مہمان کھانا  
 پکا چکی تھی۔ بالاجی کو ماں کا بنایا ہوا کھانا آج ملے توں کے بعد ملا۔ بڑی رعیت سے کھایا۔  
 مہمان کھلتی جاتی تھی اور دوتی جاتی تھی۔ جب بالاجی کھاپی کر لیٹے تو برجن نے مادھوی  
 سے کہا۔ اب یہاں کو نے میں مہمان ڈھانپ کر کیا بیٹھی ہو؟  
 مادھوی کچھ دیدو کھلے صبر نہں۔ اب یہی جی چاہتا ہے۔  
 برجن۔ مادھوی ایسی نرس نہ ہو کیا اتنے دنوں کا برت ایک دن میں بھنگ کر دیگی۔

• • • • •  
 مادھوی اٹھی مڑیل بیٹھا جاتا تھا جیسے بادل کی کالی کالی ٹھٹھا نیل تھتی ہں  
 اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جل تھل ایک مہمانیکا۔ مکرے کا یک پچھو اور چلنے لگتی ہے  
 اور سائے بادل کالی کی طرح چھٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح اس وقت مادھوی کے دل  
 کی کیفیت ہمہی تھی۔

یہ میاں دن دیکھنے کی آند اس کے دلیں کتنے دنوں سے تھی کبھی ڈن آئیگا  
 کہ میں اُنکے دیشن پاؤنگی۔ اور انکی امرت کی سی باتیں سنوگی۔ اس دن کے لئے اُس نے  
 کیسی کیسی منتیں مانی تھیں۔ اس دن کے خیال ہی سے اُس کا دل کیسا کھل اٹھتا تھا۔  
 آج صبح مادھوی بہت خوش تھی۔ اُس نے بڑے شوق سے ٹھیلوں کا مارا گوند  
 کھا۔ سینکڑوں کلنٹے ہاتھ میں چمھا لئے۔ متوالوں کی طرح گر گر بڑتی تھی یہ سب سنی  
 اور نشتہ اسی لئے تھا کہ آج وہ مہمان دن آگیا۔ آج ڈن آگیا جیسی طرف ایک

مدد ملے یا نہ سے آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ ڈرنا نہ بھی اب یاد نہیں جب یہ آرزو دل میں نہ رہی ہو۔ مگر اس وقت مادھوی کے دل کی وہ کیفیت نہیں خوشی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ غالباً ڈمادھوی کی خوشی کی انتہا تھی۔ جب وہ باغچہ میں جھوم جھوم کر پھولوں سے اکھل بھر رہی تھی۔ جس نے کبھی خوشی کا مزہ ہی نہ چکھا ہو۔ اسکے لئے اتنی ہی خوشی معراجِ کلمانی ہے۔ وغیرہ اس سے زیادہ خوشی کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی جن ہونٹوں پر کبھی ہنسی ہی نہیں آئی۔ الگ اٹھ کر انا ہی ہنسی ہے۔ تم ایسوں سے زیادہ ہنسنے کی امید کیوں رکھتے ہو۔ مادھوی بالاجی کی طرف چلی مگر اس طرح نہیں جیسے ایک نئی ڈوبی ہو۔ اور ماٹوں سے بھری ہوئی سنگ گڑھ کئے اپنے پتی کے پاس جاتی ہے۔ یہی کمرہ تھا جسے وہ اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ جب مندر خالی تھا۔ تب وہ آ آ کر اس میں آسنوں کے پھول چڑھاتی تھی۔ آج جبے دیوتا نے پاس کیا ہے تو وہ کیوں یوں چل چل کر آ رہی ہے۔

رات خوب بھیک چل چکی تھی۔ برٹک پر سے گاڑیوں کی کھنٹیوں کی آوازیں کان میں آ رہی تھیں۔ مادھوی بے پاؤں بالاجی کے کمرہ کے دروازہ تک گئی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑی کسی نے پیر تھا م لئے۔ اُلٹے قدم لوٹ آئی۔ سارے زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اُسکے دل نے کہا مادھوی! یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تو بالاجی کی چیز یہی۔ مانا کہ تجھے اُن سے پریم ہے مگر تو اعلیٰ دہن نہیں ہے۔ تجھے اس وقت اُنکے کمرے میں قدم رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ تیرا پریم تجھے اُنکی تپنی نہیں بنا سکتا۔ پریم اور چیز ہے۔ سہاگ اور چیز ہے۔ پریم دل کا جھکاؤ ہے۔ پیار ایک پاک فرم ہے۔ تب مادھوی کو ایک پیار یاد آیا۔ دو لہے نے بھری سچائی دہن

کی باہر پہنچاؤ تھی اور کہا تھا کہ اس استری کے میں اپنے گھر کی مالک اور اپنے دل کی دیوی سمجھتا ہوں گا۔ اس مجھ کے لوگ اور آکاش اور آگنی اور دیوتا اس کے گواہ رہیں۔ اہا کیسے مبارک الفاظ ہیں مجھے بھی یہ الفاظ سننے نصیب ہوئے تھے میں نہ آگنی کو اپنا سا کشتی بنا سکتی ہوں نہ دیوتاؤں کو نہ آکاش کو نہ اے آگنی۔ اے آکاش کے تاروں اے دیوتاؤں کے بامیں تم شاہد رہنا کہ ملاحوی نے بالاجی کی پاک صورت کو دلیں جگہ دی مگر کسی ناپاک خیال کو دلیں نہ آنے دیا۔ اگر میں نے کمرہ کے اندر قدم رکھا ہوتا تو آگنی تم اس وقت مجھے جلا کر رکھ کر دو۔ اے آکاش! اگر تو نے اپنی ہزار آنکھوں سے بھی مجھ کو دیکھا ہوتا تو اسی دم مجھ پر باند کا بجر گر دے۔

ملاحوی کچھ دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ یکایک اُس کے کان میں جھک جھک کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو بالاجی کا کمرہ بہت نہایت روشن ہو گیا تھا۔ اور کھڑکیوں سے روشنی باہر نکل کر صحن میں پھیل رہی تھی۔ ملاحوی کے سر تلے سے مٹی نکل گئی۔ معاً خیال گزرا کہ میز کا لیمپ بجھ گیا تھا۔ ہوا کی طرح وہ بالاجی کے کمرہ میں گھسی۔ دیکھا تو لیمپ زمین پر پھٹ کر گر پڑا ہے۔ اور فرش میں تیل کے پھیل جانے سے آگ لگ گئی ہے۔ دوسرے کمرے پر بالاجی آگاہ سے سو رہے تھے۔ ابھی تک اُن کی نیند نہ کھل چکی تھی۔ انہوں نے قالین سمیٹ کر ایک کونے میں بکھیر دیا تھا۔ بجلی کی طرح لپک کر ملاحوی نے یہ قالین اٹھا لیا اور اُسے شعلوں کے آد پر گر دیا۔ جھکا کے کی آواز نہ پئی۔ تو بالاجی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کمرہ میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف نیل کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ واقعہ کی صورت سمجھ گئے پلے "ہیری خیریت ہوئی نہ نہ کمرہ میں آگ لگ گئی تھی۔"

مادھوی: جی ہاں ظالمیپ گڑا تھا۔  
 بالاجی: تم بڑے موقع سے آ پہنچیں۔ کیسے معلوم ہوا کہ نہیں؟  
 مادھوی: میں یہیں باہر بیٹھی ہوتی تھی۔  
 بالاجی: کم کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جاکر سوؤ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔  
 مادھوی: چلی جاؤنگی، سونا تو دوسرے۔ یہ موقع نہ بھلے پھر کیا آئے۔  
 مادھوی کی آواز میں غصہ کا درد تھا۔ بالاجی نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور  
 سال پہلے انہیں نے مادھوی کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک کھیتی ہوئی گلی تھی۔ اور آج  
 ایک مڑھ جالا ہوا پھول۔ نہ پہرہ پر تانگی نہ آنکھوں میں غوغی۔ نہ ٹانگ میں سہاگ کا دھلا  
 تھا۔ نہ ماتھے پر سینہ دور کا ٹیکہ۔ جسم پر زیوریل کا نشان بھی نہ تھا۔ بالاجی نے قیافہ  
 سے سمجھا کہ بدھالائے عین شباب میں اس کو دکھایا کا سہاگ ہر لیا ہے۔ بہت غموم  
 ہو کر رہے۔ ”کیوں مادھوی۔ تمہارا بیاہ تمہو کیا ہے؟“  
 مادھوی کے کپڑوں میں چھری اتر گئی۔ آبد ہونے لگی۔ ”جی ہاں ہو گیا ہے“  
 بالاجی: ۱۔ تمہارا پتی؟  
 مادھوی: انہیں ہمیری کچھ سہی نہیں۔ انکا بیاہ مجھ سے نہیں ہوا؟  
 بالاجی: تمہارا پتی کیا کرتا ہے؟  
 مادھوی: لینش کی سیوا۔  
 بالاجی کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ مادھوی  
 کو مطلب سمجھ گئے۔ پوچھا:-  
 مادھوی! اس بیاہ کو کتنے دن ہوئے؟

مادھوی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ بہت دن ہوئے۔ شاید اٹھارہ بیس سال۔  
 بالا جی کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں اور چہرہ پر قوی غور کا فتنہ سا چھا گیا۔  
 بھارت تھا! آج اس گئے گزرے زمانہ میں بھی تمہاری گود میں ایسی ایسی دیو دیوں  
 کھیل رہی ہیں جو ایک خیال پر اپنی زندگی اور جوانی کی آنسو میں قربان کر سکتی ہیں۔  
 بولے۔ ایسے ہی تو تم تیاگ کیوں نہیں دیتیں؟

مادھوی نے بالا جی کی طرف پُر غور نگاہوں سے دیکھا۔ اور بولی۔ یہ سوامی جی! آپ  
 اپنی زبان سے ایسا نہ فرمائیں۔ میں ہندو عہدیت ہوں۔ میں نے گاننھاری اور  
 سادتری کے کل میں جنم لیا ہے۔ جسے ایک بار دل سے اپنا پتی مان چُکی اسے نہیں  
 تیاگ سکتی۔ اگر میری زندگی یوں ہی دوڑے دوڑے کٹ جائے تو بھی اپنے پتی کی طرف  
 سے مجھے ملوث ملال نہ ہوگا۔ جب تک میرے تن میں جان رہیگی میں ایشور سے انکی بھلائی  
 چاہتی رہوں گی۔ میرے لئے ہی کیا کم ہے کہ ایسے مہاتما کے پریم نے میرے دلمیں  
 باس کیا۔ میں اسی کو اپنا سوجھا گیا سمجھتی ہوں۔ آج اٹھارہ سال سے زیادہ ہوا کہ میں نے  
 بناؤ سنگار کا خیال تک دلمیں نہیں آنے دیا۔ میں نے ایک بار اپنے سوامی کو دودھ  
 سے دیکھا تھا اور وہ تصویر ایک دم کے لئے بھی میری نگاہوں سے نہیں اُتری۔ جب کبھی  
 میں بیمار ہوتی ہوں۔ اُسی تصویر نے میری تیمارداری کی ہے۔ جب کبھی میں نے  
 بیوگ کے دُکھ سے بچیں ہو کر آسو بہائے ہیں۔ اُسی تصویر نے مجھے دھارس دیا ہے  
 اُس پتی کو میں کیسے نیا گڈوں میں اُسکی ہوں اور ہمیشہ اُسی کی رہو گی۔ میرا دل اُس میری  
 جان اُسکے نذر ہو چکے آروہ کہے تو آج میں اُگ کی گود میں ایسی خوشی سے جا بیٹھوں۔  
 گویا پھول کا سج ہے۔ اگر میری جان اُسکے کسی کام آئے تو میں ایسی خوشی سے دے

دونگی۔ جیسے کوئی اُپاسک دیتا پر پھول چڑھتا ہے۔

مادھوی کا چہرہ جوش سے لگلوں ہو رہا تھا۔ بالاجی نے اُسکی سنیں اور دم بچھڑا دیے۔ یہ وہ عورت ہے جس نے صرف میرے خیال پر اپنی زندگی قربان کر دی۔ اس خیال سے ہلالجی کی آنکھیں پُرباب ہو گئیں جس پریم نے ایک عورت کی زندگی جلا کر خاک کر دی ہو۔ اُس کے لئے ایک آدمی کے استقلال کو جلا ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں۔ پریم کے مقابلہ میں ضبط کوئی چیز نہیں ہے۔ بولے: ”مادھوی! تم جیسی لویاں بھارت کے لئے سرمایہ ناتی ہیں میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تمہارے پریم جیسی انمول چیزوں میرے ہاتھ آ رہی ہے۔ اگر تم نے میرے لئے جو کتنی نینا پسند کیا ہے تو میں بھی تمہارے لئے اس سنیاس اور یوگا کو خیر باد کہہ سکتا ہوں جس کے لئے تم نے اپنے تئیں مٹا دیا ہے۔ وہ تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی نہ بچکیگا۔“

مادھوی نے فوراً جواب دیا۔ ”اس جواب کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی۔“ سوامی جی! میں بہت کمزور اور بے عقل عورت ہوں مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ذاتی آرام کا خیال آج تک ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دلیں نہیں آیا۔ اگر آپ نے یہ خیال کیا کہ میرے پریم کا معراج صرف یہ ہے کہ آپ کے پیروں میں سنسار کے بندھنوں کی بیڑیاں ڈالوں تو رہا تھا جو ذکر آپ نے اسکی حقیقت باطل غلط سمجھی۔ میرے پریم کا معراج وہی تھا جو آج مجھے حاصل ہو گیا۔ آج کا دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ آج میں اپنے پرانے ہاتھ کے سامنے کھڑی ہوں اور اپنے کانوں سے اُنکی امرت مٹی باتیں سن رہی ہوں۔ سوامی جی! مجھے اُمید تھی کہ اس زندگی میں مجھے یہ

دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر میرے پاس دُنیا کا راج ہوتا تو میں اس خوشی میں  
 اُسے آپ کے قدموں پر نشانہ کر دیتی۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے مُست کرتی ہوں کہ مجھے  
 اب چیرلوں سے الگ نہ کیجئے گا میں سنیاں لے لوں گی اور آپ کے ساتھ رہوں گی۔  
 میں دیراگن بنو گی۔ بھبھوت راؤ لگی۔ مگر آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پران ناٹھ  
 میں نے بہت دکھ سہے ہیں۔ مگر اب یہ جین نہیں سہی جاتی؟

یہ کہتے کہتے مادھوی کا گلہ دندھ گیا اُد آنکھوں سے پریم کی دھار بہنے  
 لگی۔ اُس سے وہاں نہ بیٹھا گیا مٹھکے پر نام کیا اور برجن کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ برج  
 رانی نے اسے گلے لگالیا اور پوچھا۔ کیا بات چیت ہوئی؟  
 مادھوی۔ جو کہ چاہتی تھیں۔

برج رانی۔ سچ۔ کیا لو لے؟

مادھوی۔ یہ نہ بتلاؤں گی۔

برج رانی کو گویا بڑی دولت مل گئی۔ بولی۔ ایشور نے بہت دنوں میں میرا  
 حوصلہ پُورا کیا۔ میں اپنے یہاں سے بیاہ کر دوں گی۔ مادھوی بالواسانہ انداز سے مُسکرائی  
 برجن نے کاپنتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم کو بھول تو نہ جائیگی“ اودا نکھیل سے آسنو  
 پہنے لگے۔ پھر آواز سننے لگا بولی۔ ”تو ہم سے اب بچھڑ جائیگی۔“

مادھوی۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔

برجن۔ پھل باتیں نہ بنا۔

مادھوی۔ ”دیکھ لینا“

برجن۔ دیکھا ہے۔ جوڑا کیسا پہنیں گی۔



ملا دھوی۔ سفید جیسے بگلے کا پر۔  
 برجن۔ سہاگ کا چوڑا کیسر نیے رنگ کا ہوتا ہے۔  
 ملا دھوی۔ میل اچلا رہیگا۔  
 برجن۔ تجھے چند رہا بہت پسند تھا میں اپنا دیدو گی۔  
 ملا دھوی۔ (مشکر اگر) ہمارے جگہ گنٹھی دیدینا۔  
 برجن۔ کیسی باتیں کر رہی ہے؟  
 ملا دھوی۔ اپنے سنگ گارگی۔

برجن۔ نیڑی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تو اس وقت اتنی اداس کیوں ہے۔ تو نے اس  
 رتن کے لئے کیسی کیسی تنہائی کی۔ کیسا کیسا جوگ سدا دھا۔ کیسے کیسے بر  
 رکھے اڈ آج تجھے جب وہ رتن مل گیا تو تو خوش نہیں دکھائی دیتی۔  
 ملا دھوی۔ تم بیاہ کی بات چیت کرتی ہو۔ اس سے مجھے صدمہ ہوتا ہے۔  
 برجن۔ یہی تو خوش ہونے کی بات ہے۔

ملا دھوی۔ بہن میرے بھاگ میں وہ خوشی لکھی ہی نہیں جو چڑیا بادلوں میں گھول سلا  
 بنانا چاہتی ہے۔ سدا ڈالوں بر رہیگی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی  
 کے یہ چند سال اسی طرح پریم کا سپنا دیکھنے میں کاٹ دوں۔

## الوداع

دوسرے دن بالا جی اشنان نصیبان سے فارغ ہو کر راجہ دھرم سنگھ کا انتظار کرنے لگے۔ آج راج گھاٹ پر ایک عظیم الشان گھوڑا سالہ کی بنیاد پڑنے والی تھی۔ شہر کے کوچہ بازار اُسکراتے نظر آتے تھے۔ سڑک پر دو دو پہر قیس اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سڑک میں نہاد صوکر اپنا سینہ فرش راہ کے ہوئے تھیں۔ دروازے پھولوں کی مالاکھی میں ڈالے خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ آج اس جلیبب وطن کی آمد ہے جس نے اپنا سب کچھ ملک پر قربان کر دیا ہے۔

خوشی کی دیوی اپنی سکیمیں سہیلیوں کے ساتھ مجبوراً مٹی ہو اوستی سے مجبوری پھرتی تھی۔ سچ و غم کا کہیں نشان نہ تھا۔ جا بجا لوبت جھڑک رہی تھی۔ مرد خوش وضع لباس زیب تن کئے اٹھلاتے تھے۔ عورتیں سولہوں سنگار کئے منگل گیت گاتی تھیں۔ لڑکے زعفرانی صافے باندھے کھیل لیں کرتے تھے ہر مرد و زن کے چہرے خوشی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ آج قوم کے ایک۔ سچے جاں نثار کی آمد ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ قوم کی نذر کر دیا ہے۔

بالا جی جب اپنے جاں نثار رفیقوں کے ساتھ راج گھاٹ کی طرف چلے تو سچ نے گوشہ مشرق سے نکلا کر انکا استقبال کیا۔ انکا مردانہ چہرہ جوں ہی لوگوں نے دیکھا ہر اہل زبانوں سے بھارت کی ہے۔ ”کارپن خوش نعرہ نکلا اور منہ آسمان

کو چیرتا ہوا گنبد گردوں تک جا پہنچا۔ گھنٹے اور ناقوس کی صدا میں بلند مہمیں اور  
 مسرت کے دلایز نغمے ہوا میں گونجنے لگے جس طرح سطح کو دیکھتے ہی پردے نے اُس پر نثار  
 ہونے کو ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اُسی طرح بالاجی کو دیکھ کر لوگ بڑی تیزی سے اُنکے حوالہ طرف  
 جمع ہو گئے۔ ارچن سبھا کے سوا سونہروں نے باقاعدہ سلام کیا۔ انکی خوشنما وردیاں  
 بونسب خراگ گھوڑے نظروں میں کھینچے جاتے تھے۔ اس جماعت کا ایک ایک ممبر  
 قوم کا سچا جال نثار تھا اور اُنکے پرچوش لغزے لوگوں کے دلوں کو حوصلہ سے لہریز  
 کئے دیتے تھے سرگ کے دونوں طرف تماشا میوں کا ہجوم تھا۔ نویتیں جھڑ رہی تھیں۔  
 پھول اور مہرے برس رہے تھے۔ جابجا شہر کی لٹائیں سنگار کے دھنڑے تھاواں  
 میں کانور پھول اور منسل لئے کرتی تار تار بنی تھیں۔ دُکانیں غردس زیبائی میں  
 آراستہ تھیں۔ سارا شہر رشک چمن بنا ہوا تھا اور جس طرح سادوں کے مہینہ میں  
 کلی کلی گھٹائیں اُٹھتی ہیں اور وہ کہہ سکتی گھن گرج صدا دلوں کو بلا دی ہے  
 اسی طرح اس خلقت بے پایاں کی زبانوں سے ”مہارت کی ہے“ کی حوصلہ تیز  
 آوازیں دلوں میں ولولہ اور گرمی پیدا کر رہی تھیں۔ جب بالاجی چوک میں پہنچے تو ایک  
 عجیب نظارہ دیکھا۔ پانچسو نو عمر لڑکے ادد۔ رنگ کے لیس دار کوٹ پہنے  
 رعنفرانی رنگ کے کپڑے دار صافے باندھے اور ہاتھوں میں خوبصورت سونے سے  
 سراہ کھڑے تھے۔ بالاجی کو دیکھتے ہی وہ دس دس کی قطاروں میں ہو گئے اور  
 اپنے دُٹے بجا بجا کر یہ بُرا اثر گیت گانے لگے۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

دھن دھن بھاگ ہیں اس نگری کے دھن دھن بھاگ رہے

دھن دھن اس نگری کے باسی جہاں تیرے چہرے پہ ہمارے  
بالاجی تیرا آنا میاں رک ہوئے

کیسا نظارہ دلکش تھا۔ نغمہ اگرچہ سادہ تھا مگر متعدد اور موندوں آوازوں نے  
ملکر اسے بلا کا دلکش اور پُر اثر بنا دیا تھا۔ لوگوں کے قدم وہیں جم گئے اور جو طرف سناٹا چھا  
گیا۔ خوشی میں یہ ترانہ ایسا ہی سہانا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے رات کے سسلیوں کے نغمے  
عندلیب۔ سارا عالم نقشِ حیرت بنا کھڑا تھا۔ غریب بھارت ہا سیو! تم نے ایسے  
نظارے کہاں دیکھے۔ اسوقت خدیب سیر ہو کر دیکھ لو۔ تم بقاصدان ولفناز کی نغمہ سرائیں  
سے آسودہ ہو گئے جسیںول کی نازک اداٹیاں بہت دیکھ چکے۔ گل دلکش کی بہت سیریں  
کیں مگر وہ مسرت علوی، وہ حوصلہ طلب خیز جو اسوقت ہم غمخسوس کر رہے ہو۔ بہتیرے محسوس  
اور بھی حاصل ہوا تھا۔ بقاصدان ولفناز کے نغمے اور جسیںول کی نازک اداٹیاں اور  
گل دلکش کی سیریں تمہارے فطرس کو خوش کرتی ہیں مگر تمہارے حوصلوں کو سیت اور  
کمزور بنا دیتی ہیں لیکن ایسے نظارے تم میں قومیت اور قومی جوش اور قومی مہمزدی کا  
احساس پیدا کر لے رہے ہیں مگر تم نے اپنی زندگی میں ایک بار بھی یہ نظارہ دیکھا ہے تو اس  
کا پاک نقش تمہارے دلوں سے کبھی نہ ٹھیکے گا۔

بالاجی کا وہ چہرہ روحانی مسرت کی روشنی سے منور ہو رہا تھا اور آنکھوں سے  
سیچے قومی غرور کی شعاعیں نکل رہی تھیں جس طرح کسان اپنے لہلہاتے ٹہنے کی قیمت  
کو دیکھ کر خوشی کے نشہ سے متوالا ہو جاتا ہے وہی کیفیت اسوقت بالاجی کی تھی جب  
نغمہ بند ہو گیا۔ تو انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اٹھا کر اپنے  
کندھوں پر بٹھالیا اور غلام مستی میں زور سے ایک نغمہ بگایا۔ ”بھارت مانا کی ہے“

اس طرح خراماں خراماں لوگ راجگھاٹ پہنچے۔ یہاں گنہ سالہ کی ایک شاہزادہ  
 بفک عمارت استقبالیہ کے لئے کھڑی تھی۔ صحن میں محلی فرش بچھا ہوا تھا۔ محرابیں ستون  
 اودودوازے خوشنما چھوڑلے اور پتلیوں سے سجے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر کئی ہزار گلاب  
 بندھی ہوئی تھیں۔ بالاجی نے اپنے ہاتھوں سے انکے ناندوں میں کھلی اور چھوس ڈالا۔  
 انہیں پیار سے تھپکیاں دیں۔ ایک وسیع کمرہ میں سنگ مرمر کا مٹن حوض بنا ہوا  
 تھا۔ دودھ سے لبریز۔ بالاجی نے ایک چلو دودھ لیکر آنکھوں سے لگایا اور پی  
 گئے۔ اس کے بعد ہزاروں آدمی اس چشمہ آب حیات سے فیضیاب ہوئے۔

ابھی صحن میں لوگ اطمینان سے بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ کئی آدمی بدحواس  
 دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ پنڈت بدلا شاستری سیٹھ اُتم چند اور لالہ لکھن لال  
 باہر کھڑے مل چارہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کو بالاجی سے دودو باتیں کر لینے دو۔ بدلو  
 شاستری بنارس کے نامی گرامی پنڈت تھے۔ خلیفہ تہللی تلک لگاتے۔ سیر  
 بات کی ہزاراں پہنتے اور لہنتی پگڑی باندھتے تھے۔ اُتم چند اور لکھن لال دونوں شہر  
 کے بڑے علم گہری آدمی تھے۔ خطاب کے لئے ہزاروں لکھوں خرچ کرتے اور اعلیٰ عہدہ  
 داروں کی تواضع و تکریم کا خطر و سہارت کو فرض اولیٰ سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا  
 شہر کے آدمیوں پر بڑا دباؤ تھا۔ بدلا شاستری جب کبھی شاسترا تھ کہتے تو یہ یعنی  
 بات تھی کہ فریق تانی کی خیریت نہیں خصوصاً بنارس کے پنڈے اور پرگوالہ آدمی  
 قبیل کے دوسرے محنت خود تو ان کے پسینہ کی جگہ خون بہا لے کو تیار رہتے تھے۔

شاستری جی بنارس میں ستان دھرم کے وکیل اور رکن اعظم مشہور تھے اُتم چند اور  
 لکھن لال بھی مذہبی جو شہر و خرویش سے لبریز تھے۔ اس وقت ان کی کشریف آدمی تھ

انگریزی سے خالی نہ تھی مساتق دھرم کا فرض لین تمہارے کشف الیقین کی حمایت کرتا تھا اور چونکہ بالاجی اصطلاح کے پُرندہ حامی تھے۔ اسلئے انکی مخالفت کرنا اور انہیں ک دینا مساتق دھرم کے اراکین کا فرض مذہبی تھا۔ بالاجی کی مدنا ذوقل کا میا بیوں کو دیکھ دیکھ کر انکے کلیجے پر سانپ ٹوٹا دیتا تھا۔ اور یہ لوگ عرصہ سے بالاجی کے ساتھ شامستر تھے کہ انے یا بے الفاظ دیکر فوجداری کرنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ آج ان کی دلی مرادیں برآئیں۔ پندول اور پراگواؤں کی ایک جمیعت کو تیر لکیر آ پہنچے۔

بالاجی نے ان جہانم آؤں کے آنے کی خبر سنی تو باہر نکل آئے۔ مگر یہاں کی کیفیت دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔ طرفین کے لوگ مالاٹھیاں سنبلھلے۔ آسیتن چڑھ گئے گھٹنے کو تیرا کھڑے تھے۔ شامستری جی پراگواؤں کو والد کرے کیلئے للکار رہے تھے اور سیمٹ جی باڈاز بلند فرما رہے تھے۔ کہ ان شودروں کی جھیا اڑ دو۔ ہمدالت میں دیکھ لیں گے۔ مہتا را بال بیکانہ ہوئے پائیریکا کھن لال مٹاب بھی گلا چھاڑ بھیا کر فرماتے تھے کہ نکل آئے جسے بڑا ہو۔ ایک ایک کو بستر مار دیکھا دھنگا۔ بالاجی نے جب یہ لنگ دیکھا تو راجہ دھرم سنگھ سے بولے۔ آپ بلا تراسر کھا کو ہا کر سمجھ۔ مجھے کہ اس شودر منلو سے باز آئیں ورنہ طرفین کا نقصان ہوگا اور جگ ہنسائی ہوگی الگ راجہ صاحب کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے تو اس شخص سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اسے پراگواؤں کی جمیعت پر غرہ ہے۔ مگر میں آج اُگلی صدائی شیشی کر کرے کئے دیتا ہوں۔ ان کا منشا بحر افسس اور کچھ نہیں کہ آپ پرہیز کریں مگر حبیب ناک میں او میرے باپوں بیٹے زندہ ہیں کوئی آپ کی طرف آنکھ نہیں اٹھا سکتا۔ بس آپ کے ایک اشارہ کی ذمہ داری ہے اور میں دم

کی دم میں انہیں اس شرارت کا مزہ چکھا دوں گا۔

بالاجی سمجھ گئے کہ یہ شیر بھر گیا ہے۔ اس سے مصالحت کی امید کتنی فہول؟  
راجپوت جب بھر رہا ہے تو اسے مارنے کے سطنے اند کوئی خیال نہیں تھا بلکہ  
ہر وجہ صاحب! آپ دُور اندیش ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ موقع ایسی بات کا  
نہیں ہے آگے بڑھ کر اپنے آدمیوں کو روکیے ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہو جائیگا۔

بالاجی یہ کہتے کہتے ہلکا ہلکا گئے۔ سنسہ کے لہولہ کی طرح لوگ ابھرا دھر  
سے اُٹتے چلتے آتے تھے۔ ہاتھوں میں لاکھٹیاں تھیں اور آنکھوں میں خون کی  
سُرخ چہرے غضبناک۔ یہ سب پر بل پڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ جماعت کثیر  
براگاہل کے سر پر پہنچ گئی اور قریب تھا کہ لاکھٹیاں سروں کا دوسرے لیں اور سنگین  
تیلیوں میں پھینک دیں کہ بالاجی بجلی کی طرح کووند کر ایک گھوٹے پر سوار ہو گئے۔ اور  
نہایت پُر زور لہجہ میں فرمایا۔

دیکھا تیرا یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو فوراً ہاتھ نیچے کر لو  
اور سروں کو ایک رنج آگے مت بڑھنے دو۔ مجھے غم ہے کہ تمہارے دلوں میں مرنا  
عنفہ اور جوش موجزن ہو رہا ہے۔ مرنا نہ غصہ ایک پاک جذبہ اور مقدس جوش ہے  
مگر مرنا نہ ضبط اس سے بھی زیادہ پاک اور مقدس ہے۔ اس وقت اپنے غصہ کو ضبط  
سے روکو۔ کیا تم اپنے قوم کے ساتھ کل فریقین ادا کر چکے کہ یوں جلا دینے پر آمادہ ہو۔  
کیا تم منحل ٹیکر بھی سنوئیں گے؟ کیا چاہتے ہو۔ یہ لوگ تمہارے ہی وطن۔ تمہارے ہی  
تمہارے ہی خون ہیں۔ انہیں ایسا دشمن مت سمجھو اگر وہ جاہل ہیں تو ان کی جاہلیت کو  
دور کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر وہ نہیں گالیاں دیں تو تم پر امت مافو۔ اگر وہ تم سے

لڑنے پر آمادہ ہوں تو تم سلامت روی اختیار کرو اور ایک ہوشیار حکیم کی طرح اپنے  
بد مزاج مرغبیل کے علاج کرنے میں مصروف رہو۔ میں نے تم کو باؤ از بلند منہ گزریا ہے  
اگر میرے حکم کے خلاف تم میں سے کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ قوم کا دشمن ہوگا۔

ان پر زور الفاظ نے جو طرف سکوت کا عالم طاری کر دیا جو جہاں تھا وہیں نقش  
دیوار بن گیا۔ اس ایک شخص کی آواز میں کس قیامت کا اثر تھا جس نے پچاس ہزار آدمیوں کے  
اُٹھاتے ہوئے جوش کو یوں غور کر دیا۔ جیسے کوئی ہشتیار کو چبان شریر کھڑے کو روک لیتا  
اور طاقت اُس کے لئے ذی ہمتی نہ اُس کے سرتر تاج نشانی تھا۔ نہ کسی فوج کا سپہ سالار  
تھانہ قمر اُس پاک اوجے غرض قومی خدمت کا جملہ تھا جنہوں نے انجام دی بھی خادم قوم  
کے اعزاز و امتیاز کا پیمانہ و قربانیاں ہوتی ہیں جو اپنے قوم کیلئے کرتا ہے۔

پندیل اور پراگواہوں نے بالاجی کی پُر جلال صورت دیکھی اور پُر زور وار سُنی تو  
انکا جوش بھی فرو ہو گیا جس طرح آفتاب کے نکلنے ہی پہر اچھٹ جاتا ہے۔ اسی طرح بالاجی  
کے آنے سے محافل کی یہ فوج منتشر ہو گئی۔ کتنے ہی آدمیوں نے جو شر و فساد کی نیت  
سے آئے تھے وہ غیبت سے باہر جی کے رو بہ سر جھکایا۔ اور اُن کے عقیدے مندوں کے  
زمرہ میں شامل ہو گئے۔ بدلاش استری نے ہر چند چاہا کہ پندوں کے تعصب اور  
جہالت کو مشتعل کریں مگر ناکام رہے۔

اس وقت بالاجی نے ایک نہایت پُر زور تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ آج تک  
سننے والوں کے دلوں میں منقوش ہے اور جہاں ہند کے لئے ہمیشہ مشعل کا کام آدیا۔  
جھکی لیل تو بہت سی تقریریں ہیں مگر وہ جوش وہ شعلہ اور وہ ہمتی جس سے یہ تقریر  
مرصع ہے۔ اُن کی کسی تقریر میں نظر نہیں آتی۔ انہوں نے جادوئے کلام کے زور سے



چند لمحوں میں پنڈوں کو امیروں اور پادشاهوں سے گلے ملا دیا۔ اُس جادو و صفتِ تعزیر کے یہ آخری الفاظ تھے۔

”اگر آپ مستقل مزاجی سے کام کرتے چلے جائیں گے۔ تو ضرور ایک نیا کو منزل مقصود کا شہر اختیار دکھائی دے گا۔ مگر استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا۔ استقلال بڑی ذبردست قوت ہے استقلال مردانہ خوبیوں کا بادشاہ ہے۔ استقلال اوصافِ دلدادہ کی کا جو ہر ہے۔ اسے ہرگز ہاتھ سے نہ دینا۔ تمہارے سامنے آزاد نشیں آئیں گی بہتیں متواتر مایوسیوں کا سلنا کرنا پڑے گا۔ ناکامیاں تمہاری عنان گیر ہوں گی ایسی حالتوں میں سوائے استقلال کے بہتیں کوئی قابلِ اعتماد رہنا نہ ملے گا۔ استقلال اگر کامیاب نہ بھی ہو سکے تو دنیا میں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے“

جب بالاجی مکان کی طرف چلے تو آفتاب کو شہِ مغرب میں چھپ چکا تھا۔ انہیں جوک کی رزق اور زندہ دلی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آج شہر والوں نے اس جیپ فٹن کی آمد کی مبارکباد میں شہر کو چراغاں کر لے کر تیاریاں کی تھیں۔ ترک دولوں طرف محرابیں بنائی جا رہی تھیں۔ چوراہوں پر فریح الشان پھاٹک کھڑے تھے اور دوکانوں پر چھاڑ فائوس اور ہانڈیاں زمین پر ہی تھیں۔ اس عام مسٹرکے جوش میں لوگ اپنے ذاتی دکھڑے بھٹیل گئے تھے مگر اتفاقاً کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ مسٹرکے کے سامنے سامانِ درہم برہم ہو گئے۔ بالاجی نے مکان پر پہنچ کر اخبار کھولا تو چہرہ زرد ہو گیا۔ اور دل درد مند سے ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔

راجہ صاحب نے ہنسنے لگا اور پوچھا: ”خیریت تو ہے؟“

بالاجی سردی میں طوفان آگیا۔ اور دھوا کا باندھ پھٹ پڑا۔ دس ہزار آدمی خانہ تباہ ہو گئے۔

دھرم سنگھ - اُٹ!

بالاجی - ہندوؤں آدمی سیلاب میں بہہ گئے۔ سارا شہر ہتھ مار ہو گیا۔ مکانوں کی چھتوں پر کشتیاں چل رہی ہیں۔ ارجن بھائے کے لوگ پہنچ گئے ہیں اور حتی الوسع آدمیوں کو تباہ ہونے سے بچا رہے ہیں۔ مگر اُنکی تعداد بہت کم ہے۔

دھرم سنگھ - جیٹم پُرا آب ہو گیا یا الیشور۔ تو مئی ان غریبوں کا مالک ہے۔

بالاجی - گوپال گنوں شالہ بہہ گیا۔ مکینزار گاؤں سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ تین گھنٹہ تک لگا تار دوسلا دھار مینہ برستا رہا۔ ۱۶۔ ۱۷ بجھ پانی گرا۔ شہر کے جنوبی حصے میں ساری آبادی جمع ہے۔ نہ بسنے کو مکان ہیں نہ کھانے کو دانہ سلاشلے انہار لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ بھوکوں مرے جاتے ہیں۔ اور لوگوں کے نالہ و شین سے کلیئر نہ کر آیا جاتا ہے۔ سب مصیبت زند آدمی بالاجی کو بلانے کی کوشش میں اُنکا خیال ہے کہ میرے پیچھے اُنکی مصیبتیں رفع ہو جائیں گی۔

تھوڑی دیر تک بالاجی آنکھیں بند کئے گہرے خیال میں ڈوبے بیٹھ رہے۔ ازاں بولے "میرا جانا ضروری ہے۔ میں اس وقت جاؤنگا۔ آپ سیدیا کے ارجن بھائے کو تار دے دیجئے کہ وہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹانے کو تیار رہیں؟"

راجہ صاحب نے منہ سے آمیز لہجہ میں کہا "ارشاد ہو تو میں بھی ساتھ چلوں"

بالاجی - میں وہاں پہنچ کر آپکو اطلاع دوں گا۔ میرے خیال میں آپ کے جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

دھرم سنگھ - بہتر ہوتا کہ آپ علی الصبح چلتے۔

بالاجی - جی نہیں۔ مجھے یہاں لمحہ بھر ٹھہرنا مشاق گذر رہا ہے۔ ابھی مجھ وہاں تک

پہنچیں کئی دن لگیں گے۔

دم کی دم میں سائے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سدیا میں طوفان آیا اور بالاجی کا  
ایک وقت جا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہزاروں آدمی بالاجی کو رخصت کر کے لئے نکل  
پڑے اور نو بجتے بجتے دروازہ پر قریباً پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ سدیا کی  
خیریں بکسوں ناکس کی زبان پر تھیں، لوگ ان مصیبت زدوں کی حالت پر ہمدردی  
دافسوس کندھے تھے۔ صد ہا آدمی بالاجی کے ساتھ جانے پہنچا دے تھے اور سدیا والوں  
کی امداد کے لئے ایک فنڈ کھولنے کا چرچا ہو رہا تھا۔

انھوں نے دھرم سنگھ کے محل میں شہر کی خاتونوں نے آج سب کو مبارکباد دینے  
کے لئے ایک جلسہ کیا تھا۔ خالیشان حویلی کا ایک ایک گوشہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔  
پہلے برج رانی نے کئی عورتوں کے ساتھ ایک مبارکباد کا سہنا ناگیت گایا اور اسکے بعد  
سب عورتیں حلقہ باندھ کر کاتی بجائیں آرتی کا تھاں لئے سبام کے مکان پر گئیں سبوتی  
اور چند راہمنوں کا مصافحہ کرنے کے لئے پہلی سے موجود تھیں۔ سبام ایک خاتون  
سے نکلے، ملی اہا نہیں دعا دی کہ تمہاری گود میں بھی ایسے ہی سلوٹ بچے کھیلیں۔ پھر  
رانی صاحبہ نے اُسکی آرتی اتاری اور گانا ہونے لگا۔ آج مادیوں کا چہرہ بھول کی  
طرح کھلا ہوا تھا کل کی طرح آج وہ یابوس و مغوم نہ تھی۔ آرزو میں بس کی کچھ تھیں  
انہیں آندوں نے کل اُسے لایا تھا۔ مگر آج اُسکا دل اُن آندوں سے خالی ہو  
گیا ہے۔ اسی لئے چہرہ شگفتہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ بے آرزو ہر اس دیوی نے ساری  
زندگی کاٹ دی مگر با آرزو ہر اس سے ایک دن کا دکھ بھی نہ بھگایا گیا۔

سہلے راگن کے لاپٹے مکان گونج رہا تھا کہ یکایک سدیا کی خبر یہاں بھی

پہنچی اور راجہ دھرم سنگھ یہ کہتے ہوئے سُنانے لے۔ آپ لوگ بالاجی کو رخصت  
کمر لے کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہ اس وقت سدیا جا رہے ہیں۔  
یہ سنتے ہی ادھی رات کی سی خاموشی چھا گئی۔ سُبُلما گھبرا کر اُٹھی اور دروازہ کی طرف  
لپکی۔ گویا وہ بالاجی کو روک لیگی۔ اُسکے ساتھ سبیل عورتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور  
اُسکے پیچھے پیچھے چلیں۔ برج رانی نے کہا: بچی! کیا انہیں زیرِ دستی رخصت کروا کر بھی  
تو اپنے کمرے ہی میں ہیں

سُبُلما۔ میں انہیں نہ جلائے دوں گی۔ رخصت کرنا کیسا ہے  
برج رانی۔ اُن کا سدیا لہانا ضروری ہے  
سُبُلما۔ میں کیا سدیا کو لیکر چالو بھی بھاڑ میں جلے۔ آخر میں بھی لو کوئی بھل۔ میرا بھی تو  
ان پر کوئی حق ہے۔

برج رانی۔ تمہیں میری قسم اس وقت اس قسم کی باتیں کرنا ہزاروں آدمی محض اُن کے  
بھروسے پر جی رہے ہیں۔ یہ نہ جائیں گے تو قہر ہو جائیگا۔

نحوت بلورائہ النایت اور نرمیت کے احساس پر غالب آگئی۔ مگر برج  
رانی نے سمجھ کر روک لیا سُبُلما اس واقعہ کو یاد کر کے ہمیشہ انسوؤں کرتی تھی اسے تعجب  
ہوتا تھا کہ میں آپ سے باہر کہیں ہو گئی تھی۔ رانی صاحبہ نے پوچھا۔ ”برج رانی بالاجی  
کو بچے مال کون پہنائیگا۔“

برج رانی۔ آپ۔

رانی صاحبہ۔ اور تم کیا کرو گی؟  
برج رانی۔ میں اُن کے مقبرہ تک لگاؤں گی

رانی صاحبہ۔ مادھوی کہاں ہیں؟

برجن۔ (آہستہ سے) اُسے نہ پھینڈو۔ بچاری اپنے خیال میں مگن ہے۔

اسی اثنا میں بالاجی باہر نکلے۔ انہیں دیکھتے ہی لوگوں نے پُر جوش نعروں مارا۔

”بھارت کی جے“۔ عورتیں بھی اُن کی طرف بڑھیں۔ بالاجی نے سب کو دیکھا تو نزدیک آکر

اُس کے قدم چوم لئے۔ سب نے اُنہیں اُٹھا کر چھاتی سے لگایا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر دُور جاتا

نے زبان نہ کھلنے دی۔ رانی صاحبہ پھولوں کا جیمیل لٹکے چلیں کہ اُن کے گلے میں ڈال دیا مگر پرتھو نے

اُدھر آگے نہ بڑھ سکیں۔ برج رانی چندل کا غفلت لیکر چلی مگر سکھیر، ندی کی طرح اُمڈائیں اُدھل بیٹھ

گیا۔ تنہا دھوی چلی اُسکی آنکھوں میں پریم کی چمک تھی اُوپر پریم کی سرخی۔ ہونٹوں پر دلکیز

مٹکراہٹ جھلک رہی تھی اُدھل پریم کے سنسن میں مگن تھا۔ اُس نے بالاجی کی طرف اُسی نگاہوں

سے دیکھا جتنا تھا محبت سے لرزے تھیں اُو تب سر نہ اُٹھا کر کے پھول کا جیمیل گلے میں ڈال دیا۔ ہاتھ

پر چندل کا ٹیکہ لگایا اُو پریم کا بیڑا ہاتھ میں دیا۔ ہر آنکھ ظاہری کی کسر تھی وہ بھی پوری ہو گئی

اُسوقت بالاجی نے گہری سانس لی اور انہیں معلوم ہوا کہ میں پریم کے اپار سنڈرم میں بہا ہوا

رہا ہوں ضبط کا ٹکڑا کھڑکایا اور اس شخص کی طرح جو یکا یک پانی میں پھسل پڑا ہوا ہوں

نے بے اختیار مادھوی کو باہر پکڑ لی مگر آہ اجس تیکے کا انہوں نے سہارا لیا وہ خود پریم

کی دھالیں تیزی سے ہا ہا رہا تھا۔ اُنکا ہاتھ پڑتے ہی مادھوی کے رُگ رگ میں تخیلی

سی کندگی۔ بدن میں پسینہ آگیا اور جس طرح ہوا کے جھونکے سے پتھر لوہے پر جھونے پلٹنے

کے قطرے زمین پر گر پڑتے ہیں اُسی طرح مادھوی کی آنکھوں سے آنسو کی لونبیں بالاجی

کے ہاتھ پر ٹپک پڑیں۔ یہ پریم کے موتی تھے جو ان متوالی آنکھوں نے بالاجی کے جھینٹ

کئے ہیں آج سے یہ آنکھیں پھر نہ روئیں گی؟

آسمان پر تباہے چھٹکے ہوئے تھے۔ اور انکی آمد میں بھیڑی ہوئی دیویاں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں  
 آج صبح بالاجی کے خیر مقدم میں یہ نغمہ گایا جا رہا تھا۔  
 بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

اور اسوقت عورتیں اپنے دلکش اور من بھالے نسلوں میں گارہی ہیں  
 بالاجی تیرا جانا مبارک ہوئے

آنا بھی مبارک تھا اور جانا بھی مبارک ہے۔ آنے کے وقت بھی نکھوٹے آنسو  
 نکلے تھے۔ اور جانے کے وقت بھی نکل رہے ہیں۔ کل وہ مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لئے آئے  
 تھے۔ آج اسکی اوداع کر رہے ہیں۔ انکا رنگ روپ بالکل یکساں ہے مگر ان میں کتنا  
 فرق ہے۔

## منوالی جوگن

ماوصی پہلے ہی سے مڑجھائی ہوئی، کلی تھی جس ریت اُسے خاک میں ملا دیا ہیں  
 سال کی تیسری منوالی جوگن بن گئی۔ اُس غریب کی بھی کیا زندگی تھی کیا تو ملیں کوئی  
 آنسو پیدا ہی نہیں ہوئی یا ہوئی تو قسمت نے اسے چھو لئے پھلنے دیا۔ اُس کا برم  
 عشق کا: بیاسے نے کہا تھا اُس میں ایسا سیلاب آیا کہ زندگی کی آرزوئیں اور جستیں  
 فنا ہو گئیں۔ اُس نے جو گنوں سے بستر میں۔ اے اے غلامین دنیا سے لڑاؤ ہو گئی۔ دنیا انہیں

ارمانوں اور آرزوؤں کا دوسرا نام ہے جس نے انہیں گوجریت میں دفن کر دیا ہے  
 دُنیائیں سمجھنا بھول ہے

اس پریم کے نشہ سے متوالی جوگن کو ایک جگہ قیام نہ تھا لُجے گل کی طرح  
 دس دس بچرتی اور پریم کے شدید سُناپی پھرتی تھی۔ اُس کے اندر چہرہ پر گریہ سے تنگی  
 کفنِ بہت سہلنی معلوم ہوتی تھی۔ یہ پریم کی صورت دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو  
 نکل پڑتے جب وہ اپنی بین پر کوئی بُجھن لگانے لگتی تو سُسنے والوں کے دل پریم اور  
 انوراک سے سرشار ہو جاتے تھے۔ اسکا ایک ایک شدید پریم رس میں ڈوبا ہوتا تھا۔

متوالی جوگن کو الاجی کے نام سے عشق تھا۔ وہ اپنے پردوں میں اکثر انہیں کی کیرت  
 سُناپی تھی جسے دن سے اس نے جو بگیا بھلیں لیا اور لوگ ناچ کر پریم پُچھا اور کر دیا  
 اُسی دن سے اسکی زبان پر گویا سر سوتی بیٹھ گئی۔ اُسے رسیلے پد سُسنے کو لوگ سینکڑوں  
 کوس سے چلے آتے تھے جس طرح نیسی کی صدا سُنتے ہی گویا پاں گھروں سے بیکار ہو کر  
 نکل پڑتی تھیں اُس طرح اس جوگن کی تان سننے ہی اساتوں کا ایک دریا اُبل پڑتا  
 اُسکے پد سُسنے آندے کے پیالے پینا تھا۔

اس جوگن کو کسی نے منستے یا روتے نہیں دیکھا۔ اسے نہ کسی بات کا رنج تھا  
 نہ کسی بات کی خوشی جس دل میں آرزوئیں نہ ہوں وہ کیوں ہنسے اور کیوں روتے۔ اسکا  
 چہرہ آئینہ کی تہہ دیر تھا۔ اُس پر نگاہ پڑتے ہی دیکھنے والوں کی آنکھیں پاک سرور  
 سے لبریز ہو جاتی تھیں۔

تمام شد







